عطاء الحق قاسمی

عطائیے

غالب پبلشرز کی مطبوعات

دجلہ	شفیق الرحمٰن	۲۰/-
کرنیں	″	۱۵/-
لہریں	″	۱۵/-
شگوفے	″	۱۶/-
پچھتاوے	″	۱۵/-
پرواز	″	۱۵/-
مدّوجزر	″	۱۵/-
حماقتیں	″	۲۵/-
مزید حماقتیں	″	۲۵/-
انسانی تماشا		۱۵/-
نیلا پتھّر	احمد ندیم قاسمی	۱۸/-
بزمِ آرائیاں	کرنل محمد خاں	۴۰/-
بسلامت روی	″	۴۵/-
بجنگ آمد	″	۴۰/-
مسلم لیگ کا دورِ حکومت۔	صفدر محمود	۵۰/-

عطائیے

عطاء الحق قاسمی

غالب پبلشرز

ناشر	اسد اللہ غالب
	غالب پبلشرز پوسٹ بکس ۹، ۷۰۴ ملتان روڈ لا
پہلا ایڈیشن	اگست ۱۹۸۲ء
مطبع	کمبائن پرنٹرز لاہور
کتابت	عبد الحمید بھٹی

محترم مجید نظامی کے نام

فہرست

خاکے

افتتاحیہ

"عطائیے" کے نام سے جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ دراصل مجھ "عطائی" کی تحریریں ہیں اور یوں اس کتاب کا نام اگر "عطائیے" ہے تو یہ افتخارِ فن کا اظہار نہیں، عجزِ فن کا اعتراف ہے۔ ویسے اگر آپ چاہیں تو سفرنامہ نما، کہانی نما رپورتاژ نما، انشائیہ نما اور خاکہ نما ان تحریروں کو طنز و مزاح کے کھاتے میں بھی ڈال سکتے ہیں اور مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ ان تحریروں کے بارے میں میرے دل میں جو شکوک ہیں، ان میں سے ایک شک یہ بھی ہے! بلکہ میرے دل میں یہ شک اتنا قوی ہے کہ خود پر کچھ کچھ "شکی القلب" ہونے کا گمان بھی گزرنے لگا ہے! البتہ "عطائیے" میں ایک حصّہ ایسی تحریروں پر بھی مشتمل ہے جنہیں خاکوں کا نام دیا گیا ہے، اس میں ادیبوں کی شخصیت اور فن دونوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اگر آپ ان خاکوں کے مزاحیہ حصّوں کو سنجیدہ سمجھ کر اور سنجیدہ حصّوں کو مزاحیہ سمجھ کر پڑھیں تو مجھے بھلا اس پہ کیا اعتراض ہو سکتا ہے، بلکہ مَیں تو یہی سمجھوں گا کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔

اور آخر میں ایک بات آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ مَیں نے اپنے اس "قماش" کے ڈھیر سارے مضمون نچے جنابِ شفیق الرحمان کو یہ کہہ کر پیش کیے کہ

ان میں سے جو LESSER EVIL کی ذیل میں آتے ہیں ان کی نشاندہی کر دیں تاکہ میں انہیں کتاب میں شامل کر لوں۔ انہوں نے بکمالِ عنایت یہ ذمہ داری اپنے سر لی چنانچہ یہ انتخاب انہی کا ہے جس کے لیے میں دلی طور پر ان کا ممنون ہوں، البتہ میں نے اس ضمن میں تھوڑی سی "بدعت" سے بھی کام لیا ہے یعنی بعد میں لکھی گئی کچھ تحریریں بھی اس انتخاب میں شامل کر دیں اور ایک "اجتہاد" بھی کیا اور وہ یہ کہ کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کے خیال سے ایک مزاج کی تحریروں کو "عطائیے" کے نام سے اور قدرے مختلف مزاج کی تحریروں کو "خندِ مکرّر" کے نام سے دو علیحدہ علیحدہ کتابوں کی صورت میں ترتیب دے دیا یعنی یک نہ شد، دو شد! "عطائیے" تو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اور "خندِ مکرّر" کتابت ہو چکی ہے۔ اگر پبلشر کی ذات بے نیاز نے چاہا تو آپ سے عنقریب پھر ملاقات ہو گی۔

عطاء الحق قاسمی

العطا - ۴۵۲ - جہاں زیب بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن - لاہور

الہ دین کے جنّ کا زوال!

الہ دین کا چراغ نسل در نسل ہوتا ہُوا جب الہ دین ہفتم کے ہاتھ آیا (جو ایک سیدھا سادہ انسان تھا) تو اس نے باپ کی وفات کے اگلے ہی روز چراغ زمین پر رگڑا جس سے فضا میں دھواں پھیل گیا اور پھر اس دھوئیں میں سے ان کا خاندانی جنّ خوفناک قہقہے لگاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے بازو مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے تھے اور قد آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ جب دُھواں چھٹا اور اس قوی ہیکل جنّ کی دہلا دینے والی آواز فضا میں گونجی "کیا حکم ہے میرے آقا؟" تو الہ دین ہفتم نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کہا "ذرا دوڑ کر نکڑ والی دکان سے میرے لیے ایک سانچی پان لاؤ" جنّ کو اپنے نئے باس کے اس حکم کی تعمیل میں بڑی شرم محسوس ہوئی، مگر اس نے تعمیل کی اور دوبارہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ الہ دین نے اسے حکم کا منتظر پایا تو کہا "مَیں نہانا چاہتا ہوں، بالٹی اٹھاؤ اور سرکاری نلکے سے پانی بھر کر اسے صحن میں رکھ دو" جنّ کو اگرچہ ایک بار پھر بڑی سبکی محسوس ہوئی، مگر اس نے "جو حکم میرے آقا" کہا اور غائب ہو گیا! نہانے سے فراغت پا کر الہ دین نے ایک بار پھر چراغ رگڑا جس پر ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی، فضا دھوئیں سے بھر گئی اور پھر خوفناک قہقہے لگاتا ہُوا جنّ نمودار ہُوا۔ اس نے جھک کر کہا "کیا حکم میرے آقا؟" الہ دین نے کہا بازار

سے سبزی وغیرہ لے کر آؤ اور میرے لیے جلدی سے کھانا تیار کرو' بڑی بھوک لگی ہے۔ یہ سن کر جن بہت شرمسار ہوا اور گردن جھکا کر بازار کی طرف چل پڑا۔ کھانا وغیرہ کھا کر الٰہ دین نے ایک بار پھر چراغ رگڑا جس پر جن ایک کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہوا نمودار ہُوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ الہ دین نے حکم دیا کہ ہمسایوں سے تھوڑی سی پتی مانگ کر لاؤ اور چائے بناؤ۔" یہ سن کر پسینے کے قطرے جن کی پیشانی پر نمودار ہوئے جو اس نے فوراً ہاتھ سے پونچھ ڈالے اور بادل نخواستہ حکم کی تعمیل میں مشغول ہو گیا!

اور پھر یوں ہُوا کہ دن مہینے اور سال گزرتے گئے اور وہ اپنے آقا کی خدمت میں اسی طرح مشغول رہا۔ اس کے کپڑے دھوتا، استری کرتا، جوتے پالش کرتا، برتن مانجھتا اور نکڑ کی دکان سے اس کے لیے پان اور سگریٹ خرید کر لاتا اور پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ اس دوران جن میں ایک تبدیلی رونما ہوئی' اس کی جسامت پہلے سے بہت کم ہو گئی۔ اس کا قد بھی گھٹتا چلا گیا اور اس کے قہقہوں کی گونج بھی مدھم پڑ گئی۔ ایک تبدیلی اس میں یہ رونما ہوئی کہ الہ دین کے چراغ رگڑنے پر وہ کاندھے پر رومال رکھے نمودار ہوتا اور "کیا حکم ہے میرے آقا" کی بجائے "کیا حکم ہے صاحب جی!" کہتا۔ یہ جن آہستہ آہستہ اپنی پہچان بھولتا جا رہا تھا!

سو الہ دین کے اس جن کی نقاہت اب روز بروز بڑھتی جا رہی تھی حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ اس کا قد گھٹتے گھٹتے اپنے آقا کے قد کے برابر ہو گیا۔ اس کے بازو اب مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے نہیں تھے بلکہ وہ سکڑ کر اپنے آقا جتنا ہی رہ گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی کمر میں درد ہونے لگا اور پٹھے بھی درد کرنے لگے جس کے لیے وہ باقاعدگی سے "سربیکس ٹی" کھانے لگا۔ تاہم وہ اب بھی اپنے "صاب جی" کی خدمت میں ہمہ تن مشغول رہتا۔ اس دوران الہ دین کو اپنے محلے کی ایک لڑکی سے

عشق ہو گیا، مگر سخت نگرانی کی وجہ سے اس کے ساتھ نامہ و پیام کا موقع نہیں ملتا تھا۔
ایک روز الہ دین نے چراغ رگڑا، ایک معمولی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر دھوئیں
میں سے مدقوق چہرے والا جن نمودار ہوا۔ الہ دین نے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں
تھمایا اور کہا "یہ رقعہ بلیلہ کو دے آؤ"۔ جن کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار ابھرے
اور اس نے کہا "صاب جی، میں جن ہوں کوئی . . ."۔ مگر الہ دین نے اسے خاموش
رہنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی دس کا ایک نوٹ اس کی مٹھی میں تھما دیا۔ جن کی سربکس ٹی
کی شیشی ختم ہونے والی تھی سو اس نے یہ نوٹ جیب میں ڈالا اور جھینپتے جھینپتے
وہ رقعہ بلیلہ تک پہنچا آیا، بلکہ اس کی مؤثر کارکردگی کو دیکھ کر محلے کے دوسرے نوجوان
بھی اب اس سے یہ خدمت لینے لگے۔ شروع میں اسے اس کام سے
ندامت محسوس ہوتی تھی، مگر پھر یہ اس کی عادت بن گئی۔ اس دوران وہ خود کو
تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگا۔ اب وہ پہلے سے کرّوفر والا جن نہیں تھا، بلکہ
وہ اپنی شناخت تک بھول گیا تھا۔ سو اب اسے بلانے کے لیے چراغ رگڑنے
کی ضرورت نہ تھی، وہ کاندھے پر رومال رکھے، دھوتی اور بنیان پہنے ایسے ہی
سب کی نظروں کے سامنے پڑا رہتا! اس کا قد الہ دین کے قد سے بھی چھوٹا ہو گیا
تھا، چنانچہ اب الہ دین نے اسے بلانا ہوتا تو وہ اسے "اوئے چھوٹے! ادھر آؤ"
کہہ کر آواز دیتا! ایک دن اس نے الہ دین سے کہا "صاب جی اگر آپ اجازت
دیں تو میں کہیں اور کام تلاش کر لوں، آپ کو جو تنخواہ ملتی ہے اس میں آپ کا
اپنا گزارہ بھی نہیں ہوتا"۔ الہ دین یہ سن کر جھینپ گیا اور پھر اس نے رضامندی کے اظہار
کے لیے ہولے سے اپنی گردن ہلائی۔!

سو یہ جن آج کل بابو ہوٹل میں ملازم ہے اور "چھوٹے اوئے" کی آواز

سن کر تھکے تھکے قدموں کے ساتھ ایک میز سے دوسری میز کی طرف جاتا ہے۔ کبھی کبھی اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے تو اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے بازو اور آسمان سے باتیں کرتا ہوا قد۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے محلات کو اپنی ہتھیلی پر اٹھا لینے والا ماضی! چشم زدن میں نئی دنیائیں تعمیر کرنے والا ماضی! چنانچہ ان لمحوں میں وہ دوبارہ جن کے روپ میں آنے کے لیے اپنی تمام قوتیں مجتمع کرتا ہے، مگر اپنی اس تمام تر کوشش کے نتیجے میں وہ سگریٹ کے دھوئیں جتنے مرغولے میں سے اپنی دکھتی کمر پر ہاتھ رکھے نمودار ہوتا ہے۔ اس پر وہ مارے ندامت کے سر جھکا لیتا ہے اور ہولے سے کہتا ہے "میں بڑے کرّ و فر والا جن تھا، مگر میرے آقاؤں نے مجھے کمزور کر دیا۔" اور پھر ایک دم خوفزدہ ہو کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے کہ کہیں کسی نے یہ سن تو نہیں لیا کہ وہ کبھی بڑے کرّ و فر والا جنّ تھا؟

اب اور تب

مَیں نے یاسر سے کہا "بیٹے تمہیں معلوم ہے جب ہم چھوٹے تھے اور وزیرآباد میں رہتے تھے تو ہمارے ہاں بجلی نہیں ہوتی تھی؟ ہم لالٹین جلا کر پڑھا کرتے تھے؟"

"اچھا!" آٹھ سالہ یاسر نے حیرت سے کہا "مگر ابّو یہ لالٹین کیا ہوتی ہے؟"

"بیٹے، یہ کبھی ہوتی تھی، ان دنوں بڑے شہروں میں نہیں، قصبوں اور دیہات میں ہوتی ہے تم اس کا ذکر چھوڑو، مَیں تمہیں ایک اور بات بتاؤں، اس زمانے میں ٹیلیویژن بھی نہیں ہوتا تھا!"

"اچھا!!! تو آپ شام کو کیا کیا کرتے تھے؟"

"بہن بھائی آپس میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے، کھیلا کرتے تھے، لڑا کرتے تھے۔ اور سنو اس زمانے میں ہمارے گھر میں ٹیلی فون بھی نہیں تھا۔ اور ہاں ان دنوں یہ ٹھنڈے اور گرم پانی کے نلکے بھی نہیں تھے بلکہ گھروں میں ہینڈ پمپ ہوتا تھا۔ ہم ہاتھ سے پمپ گیڑ کر بالٹی میں پانی جمع کرتے تھے اور پھر اس سے نہاتے تھے!"

"ابّو یہ ہینڈ پمپ کیا ہوتا ہے؟"

"یہ بھی ایک چیز ہوتی ہے، آج کل بھی بہت سے گھروں میں ہے۔

تمہیں کسی روز دکھاؤں گا۔"

"ابو اس زمانے میں اور کیا کیا نہیں ہوتا تھا؟"

"بیٹے یہ فلش سسٹم نہیں ہوتا تھا، ایئر کنڈیشنر بھی نہیں تھا۔ سیلنگ فین یا پیڈسٹل فین بھی نہیں ہوتے تھے۔ ان کی جگہ لوگوں نے چھتوں کے ساتھ کپڑے کے پنکھے لٹکائے ہوتے تھے جنہیں رسّی کے ساتھ کھینچا جاتا تھا اور ہاں یہ ریفریجریٹر بھی نہیں ہوتا تھا۔ ہم گھڑے کا پانی پیا کرتے تھے جس پر گرمیوں میں موتیے کے ہار پڑے ہوتے تھے۔"

میرا خیال تھا کہ اب وہ پوچھے گا کہ یہ گھڑا کیا ہوتا ہے، مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ یہ سب کچھ سن کر پریشان سا ہو گیا تاہم تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ ابھری اور اس نے اپنے ننھے منے ہاتھ جوڑ کر کہا "شکر ہے میں اس زمانے میں پیدا نہیں ہوا تھا!"

لیکن ایئر کنڈیشنر، بجلی کے قمقمے، ریفریجریٹر، ٹیپ ریکارڈر، وی سی آر، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن اور اس طرح کی دیگر بے شمار سائنسی ایجادات اپنے ساتھ صرف آسائشیں ہی نہیں، آہستہ آہستہ ایک نیا اخلاقی اور معاشرتی نظام بھی لاتی ہیں۔ سو ان لمحوں میں میں نے سوچا کہ کوئی پتہ نہیں آج سے سو پچاس سال بعد اس سرزمین پر کسی "بابے" کی اپنے کسی "ڈیڈ" کے ساتھ کچھ اس قسم کی گفتگو ہو رہی ہو۔

"بیٹے ہمارے زمانے میں لڑکے لڑکیاں یوں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سڑکوں پر نہیں پھرا کرتے تھے اور یوں کھلے بندوں "لپ سروس" (LIP SERVICE) کا مظاہرہ بھی نہیں ہوتا تھا!"

"تو پھر آپ لوگ کیا کیا کرتے تھے؟"

"بیٹے ہمارے زمانے میں ملاقاتیں سیڑھیوں میں ہوا کرتی تھیں یا ہوٹلوں کے کیبنوں میں یا یونیورسٹی لائبریری میں۔ ہم جب باہر ملتے تھے تو ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں تھے۔ اور پھر ہمارے زمانے میں بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ نہیں، "صرف کزن" ہوا کرتے تھے۔ اور یہ جو "لپ سروس" ہے ہمارے زمانے میں سرِعام نہیں ہوتی تھی۔ سرِعام تو اس کا مفہوم صرف "بول بچن" کا تھا۔ اس "بول بچن" کے ذریعے لوگ بڑے بڑے کام نکالتے تھے!"

"ڈیڈ، آپ کے زمانے میں تو پھر بلیو فلموں والے سینما بھی نہیں ہوتے ہونگے جس میں لڑکے اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ فلم دیکھنے آتے ہوں گے؟"

"نہیں بیٹے کچھ سینما ایسے تھے، مگر یہ درپردہ انتظامیہ سے چھپ کر یہ کام کرتے تھے۔ وہ آٹھ روپے کا ٹکٹ بیس روپے میں بیچتے تھے، پہلا آدھ پون گھنٹہ وہ سنسر سے منظور شدہ اصل فلم دکھاتے جس کا اشتہار اخباروں میں شائع ہُوا ہوتا۔ اس کے بعد وہ اندر کے دروازے اور باہر کا گیٹ بند کر کے صرف پانچ منٹ کے لیے ان بلیو فلموں کے ٹوٹے دکھاتے اور پھر قومی پرچم لہرا کر شو کے ختم ہونے کا اعلان کر دیتے تھے۔ مگر ان سینماؤں میں صرف مرد آیا کرتے تھے اور یا پھر جن لوگوں کے پاس وی سی آر ہوتا، وہ کسی گھر میں فلم شو کا اہتمام کرتے اور وہاں سبھی شائقین جمع ہو جاتے تھے؟"

"ڈیڈ، یہ فیملی سسٹم کیا ہوتا ہے؟"

"بیٹے! یہ کبھی ہوتا تھا، اس میں ایک باپ ہوتا تھا، ایک ماں ہوتی تھی ان کے بچے ہوتے تھے اور یہ سب مل کر ایک گھر میں رہتے تھے۔ اس فیملی سسٹم

یں خالہ، پھوپھی اور چچا اور دیگر رشتے دار بھی آتے تھے۔ یہ سب لوگ ایک دوسرے سے جھگڑتے بھی تھے، مگر اس کے باوجود ان کی خوشیاں اور دکھ سانجھے ہوتے تھے کنبے کا سربراہ اس خاندان کا بزرگ ہوتا تھا اور سب اس کا احترام کرتے تھے۔

ڈیڈ! آپ کے زمانے میں اولڈ پیپلز ہوم نہیں ہوتے تھے؟"

"نہیں بیٹے!"

"تو پھر آپ لوگ بوڑھوں کو کہاں جمع کراتے تھے؟"

"ہم میں سے جو بوڑھے ہو جاتے تھے، ہم انہیں اپنے گھروں ہی میں رکھتے تھے۔ ان کی بہت دیکھ بھال کرتے تھے اور ان کی دعائیں لیتے تھے!"

"ڈیڈ، یہ دعائیں کیا ہوتی ہیں؟"

"بیٹے! یہ بھی کبھی ہوا کرتی تھیں، خیر چھوڑو میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں ہمارے زمانے میں طلاقیں بہت کم ہوا کرتی تھیں، بچے اپنے گھروں میں پلتے تھے اور ان کے ابّو اور امّی انہیں بہت پیار کرتے تھے، جن بچوں کو ہوٹلوں، سائیکلوں کی دکانوں، قالینوں کے کارخانوں اور ورکشاپوں وغیرہ میں کام کرنا پڑتا تھا، ان کے والدین اندر ہی اندر خون کے آنسو روتے تھے!"

"اس کا مطلب یہ ہوا ڈیڈ، کہ آپ کے زمانے میں لڑکیاں اور لڑکے اپنے دوستوں کے ساتھ علیحدہ فلیٹس میں نہیں رہتے تھے؟"

بیٹے، میں نے تمہیں بتایا نا کہ ہمارے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ لڑکیاں شام کے بعد بغیر ضرورت کے گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں اور لڑکے بھی اگر ذرا لیٹ ہو جاتے تو پریشان ہو جاتے تھے!"

"تو ڈیڈ، گویا آپ لوگوں کے ہاں فرد کی آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ آپ

کو بڈھوں کے چونچلے برداشت کرنا پڑتے تھے، شادی کے بعد مرد کو ساری عمر ایک عورت اور عورت کو ساری عمر ایک مرد کے ساتھ گزارنا پڑتی تھی۔ کنبے کا سربراہ گاڈ فادر ہوتا تھا جو ہر ایک پر حکم چلاتا تھا؟"

"نہیں بیٹے ایسا نہیں تھا، تم اس سوسائٹی کو۔۔۔"

مگر وہ "یاسر" اپنے "ڈیڈ" کو ٹوک دیتا ہے اور سینے پر کراس کا نشان بناتے ہوئے کہتا ہے "اوہ جیزز! شکر ہے، میں اس زمانے میں پیدا نہیں ہوا تھا!"

گھوڑوں کے شہر میں

پنڈی سے لاہور جانے والی ریل کار میں کھڑکی کی جانب اپنی سیٹ پر براجمان ہونے کے بعد مَیں نے اِرد گرد نظر دوڑائی، تو ماحول خاصا خوشگوار نظر آیا۔ دراصل خوشحالی آہستہ آہستہ چہروں کا جغرافیہ بھی بدل دیتی ہے۔ دِبکے پِچکے چہرے اپنے آپ بھرے بھرے ہو جاتے ہیں اور پھر خوشنما لگنے لگتے ہیں سو یہاں بھی چہروں کی نمائش لگی تھی، مگر میری نظریں اپنی برابر والی سیٹ پر جمی تھیں کہ یہ سیٹ تا حال خالی تھی۔ میرے لیے انتظار کا مرحلہ سخت جانگسل تھا کہ اس نشست کے "مکین" سے میرا "مستقبل" وابستہ تھا۔ بورہم سفر سے میری جان اس طرح جاتی ہے جس طرح کوّے کی غلیل سے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ کسی بور ہم سفر کے ساتھ زندگی کا پورا سفر تو طے ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں انسان کو بالآخر صبر آجاتا ہے، لیکن ایسے ہم سفر کے ساتھ چھ گھنٹے گزارنا خاصے دل گردے کا کام ہے کیونکہ ان چھ گھنٹوں کے دوران چھبیس دفعہ گھڑی دیکھنا پڑتی ہے۔ میری "قسمت" کا فیصلہ ہونے میں صرف چند منٹ باقی تھے، کیونکہ گاڑی کی روانگی کا وقت قریب تھا۔ میرے برابر والی نشست خالی تھی۔ میرے مقدر کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

قدرت نے میرے مقدر کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ گاڑی اسٹیشن سے سرکنا شروع ہوئی، تو میری برابر والی سیٹ کے پائدان پر کسی نے پوری سے سلا ہوا خاکی

رنگ کا ایک تھیلا لاکر رکھ دیا اور بعدازاں وہ خود سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ یہی میرا ہم سفر تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ چہرے پر سفید کتری ہوئی ڈاڑھی، گال قدرے پچکے ہوئے، ناک کی ہڈی ابھری ہوئی اور اسنزی سے بے نیاز قمیص اور پتلون میں ملبوس۔ موصوف ڈاک خانے میں ملازم لگتے تھے اور لگتا تھا کہ ڈاک کا کوئی خصوصی تھیلا لاہور میں پہنچانے پر مامور ہوئے ہیں میں نے اردگرد پھیلے ہوئے خوشنما چہروں پر نظر ڈالی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا سَر تھام لیا۔ قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔

میَں نے گھر سے نکلتے وقت دعا مانگی تھی کہ مجھے اچھا ہم سفر نصیب ہو۔" موصوف مجھے مخاطب کر کے انگریزی میں ممیا رہے تھے۔

"بزرگو دعا تو مَیں نے بھی یہی مانگی تھی"۔ مَیں نے دل ہی دل میں کہا اور پھر خیر سگالی کے اظہار کے لیے اپنے دانت نکال دیے۔ ان لمحوں میں مجھے محسوس ہُوا کہ مَیں ایشیا کا ممتاز ترین منافق ہوں۔

اس ایک مسکراہٹ کے بعد مَیں نے اپنا سَر سیٹ کے ساتھ ٹکا دیا تھا اور ان کی قربت سے گوشِ دل کو غافل کر دیا تھا، مگر میرے کانوں کو ان کی ممیاہٹ بدستور سنائی دے رہی تھی۔ موصوف بڑی چابکدستی کے ساتھ انگریزی پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ مَیں نے ان کی گفتگو کو قدرے غور سے سنا، تو اندازہ ہوا کہ وہ اُردو کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ اظہار بنانے پر معذرت کر رہے ہیں اور اس کی کچھ وجوہات بھی بیان فرما رہے ہیں۔ مَیں نے مروّت، وضعداری اور اخلاق کے اعلیٰ اصولوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے اپنا چہرہ ایک بار پھر ان کی طرف کر لیا اور ان کی مسلسل گفتگو کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اثبات میں سر ہلانے لگا جس کا مطلب یہ تھا کہ مَیں جناب کی گفتگو پوری توجّہ کے ساتھ سُن رہا ہوں، حالانکہ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ موصوف

کیا فرما رہے ہیں، کیونکہ میں بہرے سے ان کی گفتگو نہیں سن رہا تھا۔ میں تو اس دوران اس ذاتی اجتہاد سے کام لے رہا تھا کہ چونکہ اللہ کی ذات بڑی بے نیاز ہے اس لیے ایسے مواقع پر اس کے بندوں کو بھی بے نیاز ہو جانا چاہیے۔

تاہم کچھ دیر کے بعد میں نے دوبارہ اپنی سیٹ پیچھے کو سرکا لی تھی اور کبوتر کی طرح آنکھیں بھی بند کر لی تھیں، لیکن بیچ بیچ میں ہنکارہ بھرتا چلا جاتا تھا اور یہ غالباً میری اس مروّت ہی کا فیضان تھا کہ موصوف کی گفتگو جاری و ساری تھی، تاہم میرے ضبط کے بندھن ایک ایک کر کے ٹوٹتے جا رہے تھے، حتیٰ کہ میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے "دشمن" کے خلاف جوابی کارروائی کی ٹھان لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی نشست ایک بار پھر آگے کو سرکائی، اپنے بیگ میں سے بیاض نکالی اور جونہی ان کا "فقرہ جاریہ" ختم ہوا میں نے "عرض کیا ہے" کہہ کر اپنا کلام بلاغت نظام شروع کر دیا۔ ایک غزل، دوسری غزل، تیسری غزل، چوتھی غزل، حتیٰ کہ میں نے پوری پانچ غزلیں مصرعوں کی بار بار تکرار کے ساتھ ان کے گوش گزار کر ڈالیں مگر میں نے محسوس کیا کہ "دشمن" کے حوصلے پست ہونے کے بجائے پہلے سے زیادہ بلند ہو گئے ہیں یعنی اس کے چہرے پر بشاشت آگئی ہے۔ اس پر میں نے جھنجھلا کر اپنی مختصر نظموں کو طوالت کے ساتھ سنانا شروع کر دیا اور میں نے محسوس کیا کہ موصوف اس دوران بھی ہمہ تن گوش ہیں، صرف ہمہ تن گوش ہی نہیں، بلکہ "مستحق" مقامات پر بڑے سلیقے سے داد بھی دے رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے ایک بار پھر بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ایک تازہ ادبی پرچے میں اپنے بارے میں شائع ہونے والے مضمون کی قرأت شروع کر دی مگر میں نے دیکھا کہ موصوف اس مضمون کا ایک ایک

لفظ پورے غور سے سُن رہے ہیں۔ اس پر میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں نے بیاض اور پرچہ دونوں بیگ میں ڈالے اور ایک بار پھر سر نشست کے ساتھ ٹکا دیا۔

"نوجوان! میں نے اچھے ہم سفر کے لیے جو دعا مانگی تھی، تم سے تمہارے باطنی تعارف کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ پوری ہو گئی ہے۔" بزرگ تو حسبِ سابق انگریزی ہی میں رواں تھے مگر اب میری رائے ان کے بارے میں کچھ بدل سی گئی تھی کہ نہ صرف قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک وہ میری سنتے رہے تھے بلکہ مجھے یہ اندازہ بھی ہوا تھا کہ برابر میں بیٹھے ہوئے انسان اور اس کی سوچوں کے ساتھ ان کی وابستگی میری طرح ظاہری نہیں، بہت گہری ہے۔ میں دراصل ان کے پہلے دھوکا کھا گیا تھا اور پھر میرے دل میں ان کی برتری اور اپنی کمتری کا احساس نمودار ہوا۔

"میں سمجھتا ہوں بڑا شاعر وہ ہے جو عوام کی طرف سفر کرتا ہے اور عوام اس کی طرف سفر کرتے ہیں، چنانچہ میرے نزدیک وارث شاہ، سچل سرمست، شاہ بھٹائی اور خوش حال خاں خٹک بڑے شاعر ہیں۔" بزرگ نے اس بار اپنی گفتگو کا آغاز لٹریچر کے وسیلے سے کیا تھا اور یہ آغاز خاصا چونکا دینے والا تھا۔ گو میرے لیے ایک چونکا دینے والا امر یہ بھی تھا کہ متواتر انگریزی بولنے والے یہ بزرگ جنہوں نے اپنا نام سید کاظم حسین رضوی بتایا تھا خاص اکبر آباد کے رہنے والے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ اسلام آباد میں ٹیلیفون کے محکمے میں ایک اعلیٰ پوسٹ پر فائز ہیں۔

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں، لیکن کیا اُردو میں بھی کوئی ایسا شاعر موجود ہے جو عظمت کے اس پیمانے پر پورا اُترتا ہو؟" میں نے اپنا رُخ

ان کی طرف موڑ کر دلچسپی سے پوچھا۔

"میرے نزدیک اقبال کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔" بزرگ نے کہا۔ "لیکن یہ اقبال ڈاکٹر اقبال ہے جو اپنے شکوہ، جواب شکوہ اور طلوع اسلام وغیرہ کے ساتھ عوام کی طرف سفر کرتا ہے۔"

اب گفتگو کا رُخ ادب سے مذہب کی طرف پھر گیا تھا۔

"ہمارے دکھوں کا علاج مذہب میں ہے۔" یہ ایک گھِسا پٹا فقرہ تھا، مگر یہ بزرگ اپنا فقرہ ابھی مکمل کر رہے تھے۔ "ایک شاعر کے لیے مذہبی ہونا ضروری نہیں، مگر ایک مذہبی شخص کے لیے پوئٹک وژن بہت ضروری ہے۔"

ان کے اس فقرے میں جو "وِزڈم" تھی، اس نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا اور پھر جوں جوں میں ان کی گفتگو غور سے سنتا چلا گیا۔ یہ احساس قوی تر ہوتا چلا گیا کہ میں زیاں کار تھا جو اتنا وقت اس بزرگ کی قربت میں گزارنے کے باوجود اس کے فیضان سے محروم رہا۔ بزرگ کی اس بات نے مجھے زیادہ متاثر کیا کہ ان کی گفتگو میں اگرچہ بیسیوں مغربی فلاسفروں، دانشوروں، مفکروں اور ان کی کتابوں کے حوالے درمیان میں آئے، لیکن ان کی بنیادی سوچ قرونِ اولیٰ کے مسلم دانشوروں کی طرح ان کی اپنی کوکھ سے اُبھرتی تھی۔

ٹرین ایک سٹیشن پر آن رُکی تھی۔ دو نوجوانوں نے میری نشست کی کھڑکی کا شیشہ بجا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اشارے سے باہر بلایا۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا، مگر وہ مجھے میری تحریروں اور تصویروں کے حوالے سے جانتے اور پہچانتے تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ پنجاب یونیورسٹی میں جیالوجی کے طالب علم ہیں اور ایک سٹڈی ٹور سے واپسی پر لاہور جا رہے ہیں۔ ٹرین چلی تو وہ بھی میرے

ساتھ سوار ہو گئے، مگر ہم گارڈ کے کیبن اور آمنے سامنے واقع باتھ روموں کے درمیانی حصے میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ اگلے سٹیشن پر یہ نوجوان اُتر کر واپس اپنے ڈبے میں چلے گئے تو مَیں دوبارہ اپنی نشست پر براجمان ہو گیا۔

"لوگوں کا تمہیں جاننا ایک پری ویلیج (PRIVILEGE) ہے۔" بزرگ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مگر تمہارا لوگوں کو جاننا اس سے بڑی پری ویلیج ہے مَیں کے ٹو کو عظیم نہیں سمجھتا، کیونکہ اسے سب جانتے ہیں، وہ کسی کو نہیں جانتا۔"

اتنے میں لاہور سٹیشن قریب آن پہنچا تھا۔ مَیں نے اپنا سامان سمیٹا اور پورے احترام کے ساتھ ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مَیں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ مَیں نے آج آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

"مَیں نے تمہیں کچھ نہیں سکھایا۔" بزرگ نے اپنا خاکی تھیلا پائیدان سے اٹھا کر کاندھوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم نے وہی کچھ سیکھا ہے جو تمہارے اندر تھا۔" اور پھر گاڑی رکنے پر سفید کتری ہوئی داڑھی، ابھرے ہوئے ناک، پچکے ہوئے گالوں اور استری سے بے نیاز قمیص اور پتلون میں ملبوس یہ نحیف و نزار سا شخص میرے ایسے انسانوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔

کچا پنکچر

ماڈل ٹاؤن ایف بلاک میں پروفیسر منان یسین کا گھر تلاش کرتے ہوئے جب میں نے بائیں جانب کو "ٹرن" لیا تو کچھ یوں محسوس ہوا جیسے موٹر سائیکل کو میرا موڑ کاٹنے کا فیصلہ کچھ زیادہ پسند نہیں آیا، کیونکہ ان لمحوں میں مجھے اس "شیطانی چرخے" کو قابو رکھنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک بار پھر کچھ یوں لگا جیسے موٹر سائیکل کا پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔ اس بار میں نے چیک کرنے کے لیے نیچے اتر کر اسے سٹینڈ پر کھڑا کیا اور اگلا ٹائر "ٹو" کر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ پنکچر ہو چکا ہے۔ "اب کیا کیا جائے؟" میں نے رفیقِ نشست احمد حسن حامد سے کہا: "اس خوبصورت بستی میں میں نے زندگی کے قریباً پندرہ برس گزارے ہیں اور میں جانتا ہوں یہاں قرب و جوار میں موٹر سائیکلوں کی کوئی دکان نہیں اور اگر ہے بھی تو آج جمعہ ہے!"

حامد نے کہا: "اسے گھسیٹ کر بس سٹاپ تک لے جاتے ہیں۔ پھر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے؟"

بس سٹاپ بھی کچھ اتنا نزدیک نہیں، چنانچہ ایک گھوڑے کی طاقت کے مالک (100 CC) اس موٹر سائیکل کو چند قدم گھسیٹنے کے بعد میرا سانس پھول گیا اور میں نے محسوس کیا کہ اس گھوڑے کے مقابلے میں میں ایک لاغر

گھوڑا ہوں۔ اتنے میں ایک کار میرے قریب آ کر رکی۔ اس میں ممکیش بیٹھا تھا اور وہ میری طرف دیکھ کر دانت نکال رہا تھا۔ ممکیش کا اصل نام جاوید تھا، مگر وہ بچپن میں ممکیش کے گانے ہو بہو ممکیش کی آواز میں دوستوں کو سنایا کرتا تھا جس سے اس کا نام ممکیش پڑ گیا تھا۔

"تم میرے ساتھ بیٹھو، یہاں قریب ہی ایک سائیکلوں کی دکان ہے جو موٹر سائیکلوں کے پنکچر بھی لگاتا ہے۔ ذرا دیکھتے ہیں کہ وہ دکان آج کھلی بھی ہے یا نہیں؟" ممکیش نے کہا۔

دکان بند تھی، البتہ ایک لڑکا ایک سائیکل میں پمپ سے ہوا بھر رہا تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ اس کے پاس کھوکھے کی چابی تو ہے، لیکن جمعہ کی نماز کا وقت چونکہ قریب ہے اس لیے اس کے پاس پکا پنکچر لگانے کا وقت نہیں ہے، کیونکہ اس کے لیے بھٹی گرم کرنا پڑے گی، البتہ وہ کچا پنکچر لگا دے گا۔ اس نے ہمیں مشورہ دیا کہ یہ عارضی پنکچر لگوانے کے بعد ہم وقت ضائع کیے بغیر سی بلاک میں واقع موٹر سائیکلوں کی دکان سے پنکچر لگوا لیں، کیونکہ اس صورت میں یہ کسی بھی وقت دوبارہ پنکچر ہو سکتا ہے۔

موٹر سائیکل میں سائیکل کا پنکچر لگوانے کے بعد میں نے احمد حسن حامد کو جلدی سے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر میں نے موٹر سائیکل کا رُخ فل سپیڈ پر سی بلاک کی طرف موڑ دیا۔ میں جلد سے جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا تاکہ عارضی پنکچر کہیں رستے ہی میں نہ اکھڑ جائے اور یوں ہمیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ رستے میں شک پڑنے پر میں نے ایک جگہ موٹر سائیکل کھڑا کیا اور اگلے پہیے کی ہوا چیک کی۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ہوا اپنی پوری مقدار

میں موجود تھی۔ سی بلاک میں پنکچر کی دکان کھلی تھی۔ میں نے وہاں بریک لگائی اور ایک بار پھر ہوا چیک کی، تو وہ ٹھیک تھی، چنانچہ مَیں نے حامد سے کہا۔ یہ دکاندار مصروف ہے۔ آگے کسی دوسری دکان سے پنکچر لگوالیں گے۔" اور پھر موٹر سائیکل کا رُخ فیروز پور روڈ کی طرف پھیر دیا۔ راستے میں پنکچر کی دو ایک دکانیں کھلی تھیں، مگر مجھے جلدی تھی، چنانچہ مَیں اسی طرح چلتا ہوا اپنے گھر دنڈسر پارک پہنچ گیا۔ مَیں نے سوچا پکا پنکچر کل لگوالیں گے۔

اگلے روز صبح گھر سے نکلتے وقت مَیں نے اگلا ٹائر چیک کیا اور مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ ابھی تک ہوا کی پُوری مقدار اس میں موجود ہے تاہم مَیں نے فیصلہ کیا کہ رستے میں کہیں سے پکا پنکچر لگوا لیا جائے تاکہ پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، لیکن یکے بعد دیگرے کی فوری مصروفیات کے باعث میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس دوران میں کئی دکانوں کے سامنے سے بھی گزرا، مگر اپنی شدید مصروفیات کی وجہ سے پنکچر نہ لگوا سکا، تاہم اس تمام عرصے میں میرے دل کو ایک دھڑکا سا لگا رہا کہ کہیں یہ چلتے چلتے اچانک پنکچر نہ ہو جائے، چنانچہ شام کو جب مَیں بخیریت گھر پہنچ گیا تو مَیں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ دل میں تہیہ کیا کہ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ "ایک گھوڑے کی طاقت کے مالک" اس موٹر سائیکل کو پکّا پنکچر لگواؤں گا!

مگر جب اگلی صبح بھی مَیں نے ٹائر کو صحیح حالت میں پایا تو میرے اندر ایک نئی خود اعتمادی پیدا ہوئی اور مَیں نے سوچا کہ کچّا پنکچر بھی کوئی ایسی کچّی چیز نہیں ہے۔ اس ضمن میں مزید تقویت مجھے اپنے بعض دوستوں کی طرف سے حاصل ہوئی جنہوں نے مجھے یقین دلایا کہ کچّے پنکچر اور پکّے پنکچر میں کوئی

فرق نہیں ہے۔ اصل چیز مستری کی مہارت ہے۔ اگر پنکچر لگانے والا ماہر ہو تو کچّا پنکچر بھی لوہے کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ اناڑی ہو، تو پکا پنکچر بھی عارضی ثابت ہو سکتا ہے! لہٰذا تم بے فکر ہو کر موٹر سائیکل چلاؤ! خطرے کی کوئی بات نہیں، چنانچہ میں نے اپنے ذہن سے سارے خدشات جھٹک دیے اور یہ فیصلہ کیا کہ پکا پنکچر لگوانے پر وقت ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور پھر میں پورے اعتماد سے پورے شہر میں موٹر سائیکل پر دندناتا رہا!

جب اگلے روز شہر سے گیارہ میل دور ایک ویران جگہ پر موٹر سائیکل کا کچّا پنکچر اچانک اکھڑ گیا تو مجھے شدید غصہ آیا اور آج کئی دن گزرنے کے بعد بھی میں اس کوفت کا سوچتا ہوں جو اس واقعہ کی وجہ سے مجھے اٹھانا پڑی، تو ایک بار پھر جھنجھلا اٹھتا ہوں۔ یہ اسی کوفت کا نتیجہ ہے کہ میں یہ تمام واقعہ اپنے تمام دوستوں کو اس تفصیل کے ساتھ سناتا ہوں، مگر وہ بیچ ہی میں بور ہو جاتے ہیں اور "اُباسیاں" لینے لگتے ہیں۔ بس ایک دوست ایسا تھا جس نے یہ واقعہ پوری دلچسپی سے سنا اور پھر آخر میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "یہ واقعہ صرف تمہارے ساتھ ہی پیش نہیں آیا، بارہا پوری قوم کے ساتھ پیش آچکا ہے جب کبھی گاڑی کا کوئی پہیہ پنکچر ہوتا ہے، مارشل لاء کا کچّا پنکچر لگا دیا جاتا ہے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ٹائر میں ہوا کی پوری مقدار برقرار رہنے اور دوستوں کی طرف سے حوصلہ افزا مشوروں کے نتیجے میں ڈرائیور میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کچے پنکچر ہی کو پکے پنکچر کا متبادل سمجھنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ خیر چھوڑو! یہ بتاؤ پھر تم نے موٹر سائیکل کا کیا کیا؟"

"کرنا کیا تھا!" میں نے کہا: "مجھے قریباً تین میل تک اسے گھسیٹنا پڑا، مگر

موٹر سائیکلوں کی کوئی دکان نظر نہ پڑی! یہاں بھی سائیکلوں ہی کی ایک دکان دکھائی دی جہاں مستری نے کچا پنکچر لگایا اور مجھے ہدایت کی کہ اوّلیں فرصت میں پنکچر لگوا لوں!"

"پھر تم نے پکّا پنکچر لگوایا کہ نہیں ؟" دوست نے پوچھا۔

"ایک دو دن میں انشاء اللہ لگوا لوں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے موٹر سائیکل ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ میں نے متعدد بار اس کی ہوا چیک کی ہے۔ سب ٹھیک ہے ۔۔ اور پھر یار یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ ہر بار کوئی تلخ تجربہ ہی ہو۔ مجھے تو یہ مستری پہلے مستری سے بہتر لگا ہے۔ اصل چیز تو مہارت ہے نا۔ میرے خیال میں اب کے کچّا پنکچر چل جائے گا!"

گاڑی کے دو ڈبّے

راولپنڈی جانے کے لیے لاہور ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ریل کار کے عمومی درجے میں جب مَیں نے داخل ہونے کی کوشش کی، تو دروازے میں انسانوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے پایا۔ مَیں نے صرف چند گھنٹے پیشتر اپنی سیٹ بک کرائی تھی اور میرے سفارش کنندہ نے معذرت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس وقت صرف عمومی درجے میں ایک سیٹ دستیاب ہے اور وہ بھی بس یوں سمجھیں کہ صرف آپ کے لیے ہے اور اب میرے سامنے سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار تھی، جسے چیر کر مجھے اپنی سیٹ تک جانا تھا۔ مَیں نے پائیدان پر بڑی مشکل سے پاؤں جمائے اور اپنے لیے راستہ بنانے کی خاطر اپنی داہنی کہنی دروازے میں کھڑے ایک قوی ہیکل شخص کے پیٹ میں "گھونپ" دی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر بے نیازی سے سیٹی بجانے میں مشغول ہو گیا۔ میری کہنی کی حیثیت غالباً ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں تھی جو اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنے پیٹ پر رینگتی سی محسوس ہوئی اور پھر وہ اس چیونٹی سے غافل ہو گیا۔ اس "آستانے" سے مایوس ہو کر مَیں نے برابر والے در پر اپنا سرِ نیاز جھکا دیا جہاں ایک نحیف سا انسان کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا، مگر میری تمام تر "قوّتِ ایمانی" کے باوجود وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہُوا،

کیونکہ اس کے پیچھے انسانوں کا جمِ غفیر تھا جو ایک دوسرے میں کچھ اس طرح دھنسے ہوئے تھے کہ کسی بڑے آپریشن ہی کے ذریعے انہیں علٰحدہ کیا جا سکتا تھا تنگ آ کر مَیں نے اپنا پاؤں پائیدان سے واپس پلیٹ فارم پر رکھ دیا اور ریلوے کی سفید وردی میں ملبوس، بازو پر سُرخ پٹی باندھے ہوئے ٹکٹ کنڈکٹر کے پاس گیا اور کہا: "مجھے بتایا گیا تھا کہ ایئر کنڈیشنڈ بوگی میں کوئی سیٹ دستیاب نہیں ہے! تاہم ممکن ہے اس دوران کسی مسافر نے اپنی سیٹ کینسل کرا دی ہو، اگر ایسا ہوا ہو تو براہِ کرم یہ سیٹ مجھے بُک کر دیں!" اس پر چارٹ ہاتھ میں پکڑے ہوئے کنڈکٹر نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ مَیں کوئی اسامی نہیں ہوں" اس نے بے رخی سے کہا: "گاڑی روانہ ہونے تک میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ۔ گوجرانوالہ اسٹیشن پر مجھ سے پتہ کریں:" اسی اثنا میں، گارڈ نے سیٹی بجائی اور۔ پھر تھوڑی دیر بعد گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی۔ مَیں دوڑ کر عمومی درجے کی بوگی کے پائیدان سے لٹک گیا۔ وہاں انسانوں کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار اسی طرح موجود تھی، قریب تھا کہ میرے ہاتھ سے ہینڈل چھوٹ جاتا، مگر اس بار دروازے میں کھڑے اس قوی ہیکل شخص نے مجھے فوراً بازو سے اپنی طرف کھینچا اور پھر مجھے راستہ دینے کے لیے قدرے ترچھا ہو کر کھڑا ہو گیا، لیکن اس دیوار کے آگے اور بہت سی دیواریں تھیں اور میں ان سب کو پھلانگتا ہوا بمشکل تمام اپنی سیٹ تک پہنچا۔ اس جدّوجہد میں سارا جسم پسینے میں نہا گیا تھا اور میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

یہ بوگی انجن کے بالکل ساتھ "واقع" تھی اور میری نشست سے ایک گز کے فاصلے پر جو دروازہ تھا وہ انجن کی طرف کھلتا تھا۔ یہ دروازہ تھوڑی تھوڑی

دیر بعد خود بخود کھل جاتا اور سارا کمپارٹمنٹ ایک خوفناک شور سے گونج اُٹھتا۔

ادھر کھڑکی سے تیز دھوپ بھالے کی طرح میرے جسم میں اتر رہی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ میرے برابر میں کھڑے مسافروں میں سے ایک نے خود کو سہارا دینے کے لیے اپنا ایک ہاتھ میری نشست کی ٹیک پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں گٹھڑی تھی جو میرے چہرے کے عین سامنے تھی اور یوں میں اپنا سر نہ پیچھے لے جا سکتا تھا، نہ سیدھا رکھ سکتا تھا اور نہ اسے آگے کو لے جا سکتا تھا۔ میری زبان کانٹے کی طرح خشک ہو رہی تھی۔ مگر میری رسائی باتھ رُوم میں لگے بیسن تک ممکن نہیں تھی کہ یہ راستہ بھی انسانوں سے اٹا ہوا تھا۔ میری نشست سے ذرا فاصلے پر ایک پاگل صرف لنگوٹی باندھے کھڑا تھا، اس کی ڈاڑھی بے ہنگم طور پر بڑھی ہوئی تھی۔ بال کھلے تھے اور اس کے بڑھے ہوئے پیٹ پر مَیل کی تہیں جمی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر بعد اپنے دونوں ہاتھ پہیوں کی طرح چلاتے ہوئے اور منہ سے "چھک چھک" کی آواز نکالتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا اور جب اسے رستہ نہ ملتا تو وہ منہ سے انجن کی طرح خوفناک چیخ مارتا۔

گوجرانوالہ اسٹیشن پر میں کھڑکی کے راستے باہر کُودا اور دوڑ کر ٹکٹ کنڈیکٹر کے پاس گیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "میں نے ابھی چیک کیا ہے۔ آپ کو ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں سیٹ مل سکتی ہے۔ آپ چل کر بیٹھیں، میں آکر ٹکٹ کاٹتا ہوں۔" اسے اب غالباً کسی گاہک کی اُمید نہ تھی، تاہم میں نے یہ خوشخبری سن کر اپنی چال میں ایک وقار سا پیدا کیا اور یوں ہولے ہولے چلتا ہوا ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔

یہ کمپارٹمنٹ دودھیا روشنیوں اور دودھیا چہروں سے منور تھا۔ یہاں

لوگ اس طرح اطمینان سے بیٹھے تھے جس طرح گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوں۔ یہاں دھوپ کی نوکیلی کرنوں اور حبس کا داخلہ ممنوع تھا۔ اس بدترین موسم میں بھی کمرے کی فضا میں ہلکی سی خنکی کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ مَیں نے اپنی سیٹ تلاش کی اور پھر اسے پیچھے کی طرف سرکا کر نیم دراز ہو گیا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے حبسِ بیجا سے رہائی کے بعد مَیں خود کو ایک عجیب عالم میں محسوس کر رہا تھا اور سرشاری کی ایک نامعلوم سی کیفیت میرے جسم میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ ان لمحوں میں مجھے احساس ہُوا کہ مَیں کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگنے والا ایک انسان نہیں بلکہ سچ مچ کا اشرف المخلوقات ہوں۔ مَیں نے اپنی نشست کے ساتھ لگی بیل (BELL) پر انگلی رکھی اور تھوڑی دیر بعد ایک باوردی ویٹر میرے پاس آکر نیم ایستادہ ہو گیا۔ مَیں نے اسے یخ بستہ کوک گلاس میں لانے کا آرڈر دیا اور پھر کھڑکی کے بڑے بڑے شیشوں میں سے تیزی سے گزرتے ہوئے خوبصورت مناظر کو آنکھوں میں سموتے ہوئے مَیں نے کوک کی چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ گلاس میں برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے جس سے گلاس کے باہر کی سطح نم آلود ہو گئی تھی۔

گجرات تک پہنچتے پہنچتے میرے اوسان مکمل طور پر بحال ہو چکے تھے:
چنانچہ کچھ دیر کے لیے گاڑی رکی تو پلیٹ فارم پر اتر کر پھر وہی باوقار سی چال چلتا ہوا اپنے پہلے ٹھکانے کی طرف گیا۔ مَیں یونہی اس کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے جھلسا دینے والی دھوپ ڈبے میں داخل ہو رہی تھی۔ یہاں ڈبے کے مکین پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پیاس کی شدت سے ان کی زبانیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور ان کے سانس دھونکنی کی طرح چل رہے تھے۔ عورتیں، بچے

اور بوڑھے چھت سے چپکے ہوئے سہارے کے ساتھ چمگادڑوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ ان کے درمیان لنگوٹی میں ملبوس، بے ہنگم داڑھی والا پاگل اپنے میلے ننگے پیٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔ مجھے کھڑکی میں سے اس کا صرف نچلا دھڑ نظر آیا اور پھر مجھے اس کے منہ سے نکلتی ہوئی چھک چھک کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے قدم بڑھائے اور جب اسے راستہ نہ ملا تو اس نے انجن کی طرح خوفناک چیخ ماری، مگر اس ڈبے کا صرف یہی مسافر ایسا تھا، ورنہ باقی مسافر تو پہلے کی طرح اپنی چیخیں اپنے سینوں میں دبائے بیٹھے تھے۔

دو آسمانوں کے درمیان میں

اس روز آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لاہور ایئرپورٹ کے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے ہمیں خاتون اناؤنسر کی آواز سنائی دی: "راولپنڈی کی فلائٹ لاہور پہنچ گئی ہے۔"

"واقعی پہنچ گئی ہے؟" میرے دوست نے چہرے پر حیرانی بکھیرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ پھر اس نے مجھے مخاطب کیا اور کہا: "ذرا ان پی آئی اے والوں کو دیکھو۔ ان کے لیے فلائٹ کا راولپنڈی سے لاہور بخیریت پہنچ جانا باقاعدہ ایک خبر ہے جسے وہ پورے اہتمام کے ساتھ لاؤڈ سپیکر سے نشر کرتے ہیں۔"

اس ستم ظریف کو ابھی اس "خبر" پر مزید تبصرہ آرائی کرنا تھی، مگر دریں اثنا لاہور سے راولپنڈی جانے والی فلائٹ بھی "اناؤنس" ہو گئی؛ چنانچہ ہم نے دوڑ کر کڑک مرغی ایسے "فوکر" میں پناہ لی۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی اور جہاز تک پہنچتے پہنچتے ہمارے کپڑے بھیگ گئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد فوکر فضا میں تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے نیچے جھانکنے کی کوشش کی، مگر نیچے دھند تھی اور گھرے بادل تھے۔ زمین بھی آسمان لگ رہی تھی۔ یوں ہم دو آسمانوں کے درمیان پرواز کر رہے تھے۔

"ہم ایک ہی آسمان سے شکوہ کناں رہتے ہیں، آج دو ہو گئے ہیں۔" میں

نے اپنے دوست سے مخاطب ہو کر کہا۔ اس کی نظریں بھی کھڑکی ہی کی جانب تھیں۔

"نبز ڈلاں گے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر تم ان فوکر صاحب کا حلیہ ملاحظہ کر رہے ہو؟"

"ہاں! وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔" میں نے نشستوں اور دیگر ساز و سامان کی خستہ حالی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا: "یہ فوکر تو مجھے ویسے بھی جہاز نہیں لگتا، بلکہ لگتا ہے جیسے جہاز کے بچے نکلوائے ہوئے ہیں۔"

میرے دوست نے حفاظتی پیٹی کھول لی تھی اور اب ٹانگیں پسارنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش کے دوران اس کے گھٹنے بار بار اگلی سیٹ سے جا ٹکراتے تھے۔

"اس مسافر کو دیکھ رہے ہو؟" میرے دوست نے بائیں جانب کی ایک نشست پر براجمان ایک خوفناک سی شکل و صورت کے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ مجھے ہائی جیکر لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ اٹھ کر کاک پٹ کی طرف جائے گا اور پائلٹ کو طیارے کا رُخ لیبیا وغیرہ کی طرف موڑنے کو کہے گا۔ آہا میں نے ابھی تک لیبیا نہیں دیکھا۔"

یہ فقرہ مکمل کر کے ابھی وہ روڈین کا قہقہہ لگانے ہی کو تھا کہ جہاز ایک جھٹکے سے یک دم نیچے کو ہو گیا بالکل اسی طرح جیسے کسی بات پر بیٹھے بیٹھے دل ڈوب سا جاتا ہے اور پھر وہ مسلسل ڈولنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی رکشہ ٹوٹے ٹبوں والی سڑک پر چل رہا ہے۔

"تم بھی اپنی حفاظتی پیٹی باندھ لو۔" میرے ہنوڑے دوست نے دوبارہ

حفاظتی پیٹی باندھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی ہنسی غائب ہو گئی تھی اور اس کے ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ غالباً وہ کلمہ طیّبہ کا ورد کر رہا تھا۔

"ایسے موسم میں ایئر پاکٹس زیادہ ہوتی ہیں، مگر اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے تسلّی دینے کی کوشش کی، جبکہ جہاز کے دیگر مسافروں کی طرح خوف کے مارے میری زبان بھی تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ میں نے حفاظتی پیٹی باندھ لی اور اب اپنا دھیان ہٹانے کے لیے یونہی ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ . . ." میرے دوست کا فقرہ نامکمل رہ گیا، کیونکہ جہاز ایک بار پھر پورے شدّ ومد کے ساتھ ہچکولے کھانے لگا تھا۔ اس نے اپنا دھیان دوسری طرف مبذول کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں میں اخبار تھام لیا اور اپنے ہونٹ مضبوطی سے سیکڑ لیے۔

اب جہاز متواتر جھٹکوں کی زد میں تھا۔ میری اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ جہاز کے دیگر مسافر بھی شدید خوفزدہ نظر آ رہے تھے، مگر وہ جو کہا جاتا ہے کہ سکاؤٹ خطرے میں مسکراتا ہے اور سیٹی بجاتا ہے۔ سو میں نے خطرہ سامنے پا کر مسکرانے کی کوشش کی اور سیٹی بجانے کی کوشش کی۔ میں غالباً ان میں سے اوّل الذکر کوشش میں کامیاب ہو سکا، کیونکہ میرے سہمے ہوئے دوست نے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا اور جھلّا کر کہا: "یہ دانت کیوں نکال رہے ہو؟"

"میں خود دانت نہیں نکالوں گا تو تھوڑی دیر بعد ویسے ہی نکل جائیں گے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنے دانت آپ نکالے جائیں۔ تم بھی کوشش کرو۔"

غالباً میری بات میرے دوست کی سمجھ میں آ گئی تھی، کیونکہ تھوڑی دیر بعد

وہ مسکرانے کی منزل طے کر کے قہقہے لگانے کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔

جہاز نے ایک بار پھر غوطہ کھایا۔

"یار ذرا کھڑکی میں سے دیکھنا کہ مقامِ قبرستان کون سا ہے۔ کہیں سبزہ نورستہ بھی ہے یا نہیں؟ اور ذرا یہ بھی پتہ کرو کہ لحد پر شبنم افشانی وغیرہ کا بندوبست کیا ہے؟" میرے دوست کا چہرہ خوف سے متغیر تھا، مگر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ دو روز قبل ٹریفک کے ایک حادثے کا شکار ہوا تھا اور اس کی پیشانی پر چوٹوں کے خاصے نشان واضح تھے۔ وہ انہیں ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہا تھا۔

"یہ سب کچھ معلوم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" مَیں نے قہقہہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بارے میں تو امدادی کام کرنے والوں میں یہ کنفیوژن پیدا ہو جائے گا کہ اس کی پرانی چوٹیں کون سی ہیں اور نئی کون سی ہیں؟"

اس پر میرے دوست نے بھرپور قہقہہ لگایا اور اس اثناء میں مَیں نے محسوس کیا کہ دوسرے مسافروں کو ہمارے یہ قہقہے زہر لگ رہے ہیں، کیونکہ بہت سی آنکھیں کھا جانے والی نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھیں، مگر پھر یہ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور ہونٹ ہلنے شروع ہو گئے، کیونکہ جہاز ایک بار پھر شدید ہچکولوں کی زد میں تھا۔

"مَیں تمہیں ایک بات بتاؤں؟" مَیں نے تھوک نگلتے ہوئے اپنے دوست کو مخاطب کیا۔ "مَیں نے احتیاطاً کلمہ طیبّہ کا وِرد کر لیا ہے کہ اللہ جانے موقع پر اس کا موقع ملے نہ ملے۔"

جواب میں میرے دوست نے مسکرانے کی کوشش کی، مگر اس کی یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کی دہلیز پار نہ کر سکی۔ مجھے صرف اس کے لب ہلتے

ہوئے محسوس ہوئے۔

باہر وہی دو آسمان تھے۔ ایک نیچے اور ایک اوپر اور ہمارا ذکر پھُدکتا ہوا ان کے درمیان میں سے گزر رہا تھا۔

دریں اثنا اناؤنسمنٹ بوتھ میں سے ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا: "خواتین و حضرات! ہم تھوڑی دیر بعد اسلام آباد ایئر پورٹ پر لینڈ کریں گے۔ ہمیں اُمید ہے آپ کا سفر بہت خوشگوار گزرا ہوگا۔"

اس بار ہم دونوں کا قہقہہ خاصا بلند تھا اور اس قہقہے میں غالباً منزلِ مقصود تک پہنچنے کے اعلان کی مسرت بھی شامل تھی۔

ایئر پورٹ پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ جہاز کی سیڑھیاں اُترنے کے بعد سطحِ زمین پر قدم رکھتے ہوئے مَیں نے ایک طویل سانس لیا اور پھر اپنے دوست کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم جانتے ہو جہاز کے باقی مسافر کتنے خوفزدہ تھے اور اس کے برعکس ہم دونوں اتنے گونجدار قہقہے کیوں لگا رہے تھے؟ اس لیے کہ وہ ہم تھے جو سب سے زیادہ خوفزدہ تھے۔ سب سے زیادہ خوفزدہ آدمی کی بڑھک سب سے زیادہ گونجدار ہوتی ہے۔"

ریت کی دیواریں

"مطبوعات" کے دفتر کا دروازہ بغیر کسی دستک کے کھلا اور سبز لبادے میں ملبوس ایک ملنگ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں کڑے اور گلے میں منکوں کی مالا تھی۔ اس کے گہرے سانولے چہرے پر چھوٹی چھوٹی سفید ڈاڑھی تھی۔ نووارد کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی، مگر وہ جسمانی طور پر خاصا صحت مند تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے ہاتھ میں ایک نوٹ بک تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی نوٹ بک خالد احمد کے ہاتھوں میں تھمائی اور کہا: "بچہ تو بہت کچھ پڑھتا ہے، یہ بھی پڑھ کر دیکھ!" ایک طویل عرصے سے بے روزگار خالد احمد نے اپنے بڑھے ہوئے شیو میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر یہ نوٹ بک اس سے "وصول" کر کے بے نیازی سے میری طرف بڑھا دی۔ میں نے اشتیاق سے اس نوٹ بک کا ٹچ بٹن کھولا اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔

اور میرے لیے اس نوٹ بک کی ورق گردانی ایک عجیب و غریب تجربہ تھا، کیونکہ اس نوٹ بک میں وکیلوں، مجسٹریٹوں، سول ججوں اور پولیس انسپکٹروں وغیرہ کے تصدیقی سرٹیفکیٹ تھے جن کے مطابق یہ ملنگ موصوف "ولایت" کے مقام پر فائز تھے۔ ان اسناد کے نیچے باقاعدہ مہر اور دستخط ثبت تھے۔ میرے چہرے پر ایک مسکراہٹ

نمودار ہوئی۔ گویا اولیاء اللہ دنیا داروں سے "ولایت" کی اسناد حاصل کرتے ہیں۔

"فراڈ!" میرے منہ سے بے ساختہ یہ لفظ نکلا اور میں نے یہ نوٹ بک نجیب احمد کو تھما دی۔

نجیب احمد نے بھی ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر یہ واپس ملنگ کو لوٹاتے ہوئے کہا: "باباجی معاف کرو۔"

"معافی بھی مل جائے گی بچہ!" ملنگ نے عصا زمین پر مارتے ہوئے کہا۔ "یہ علیؓ کا ملنگ آیا کس لیے ہے۔"

میں، خالد اور نجیب گپ شپ کے موڈ میں تھے اور یوں اس کی یہ "معرفت" کی گفتگو ہمیں کچھ اچھی نہیں لگی؛ چنانچہ ہم تینوں نے یک بار کہا: "باباجی! اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔ آپ سے ایک بار کہہ دیا ہے معاف کریں۔ اب آپ جائیں۔"

"میں بابا فریدؒ کے دربار سے آیا ہوں۔ میرا نام بابا مستان شاہ ہے۔ پاکپتن سے آیا ہوں تم کہتے ہو، تو چلا جاتا ہوں۔" ملنگ نے کہا، مگر وہ بدستور اپنی جگہ پر کھڑا تھا اور کنکھیوں سے ہمارے ردِّ عمل کا جائزہ لے رہا تھا۔

اور ان لمحوں میں میں ایک اور عجیب و غریب تجربے سے دوچار ہوا مجھے یقین تھا کہ اس شخص کا اولیائی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض بہروپیا ہے، مگر اس کے باوجود میں نے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی محسوس کی۔ میرے ذہن میں سوچ کی ایک لہر آئی کہ اگر یہ واقعی کوئی بزرگ ہے، تو ہمیں اپنی اس بے ادبی کا خمیازہ یقیناً بھگتنا پڑے گا۔ غالباً یہی ردِّ عمل خالد احمد اور نجیب احمد کے چہروں سے بھی نمایاں تھا، کیونکہ مستان شاہ پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنے قدموں پر

کھڑا ہو گیا تھا۔

"تم کبھی پاکپتن گئے ہو؟" اس نے اپنی آنکھوں میں ڈھیر ساری بزرگی جمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مَیں نے بابا صاحبؒ کے مزار پر حاضری دی ہے۔" نجیب نے جواب دیا۔

"تو پھر مَیں چلا جاؤں؟" اس نے عجیب و غریب انداز میں پوچھا اور ہم تینوں کہ اندر سے سہمے ہوئے تھے، گونگے ہو کر رہ گئے۔

"نہیں۔ مَیں نہیں جاؤں گا!" وہ ہماری کیفیت بھانپ گیا تھا اور پھر دو قدم چل کر میری طرف آیا۔ "مَیں پنجتن کے نام پر تمہیں زور سے پانچ مکے ماروں۔" اس نے مٹھی فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

گو اس کے بارے میں میرے خیالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ یعنی مجھے یقین تھا کہ وہ فراڈ ہے، لیکن مَیں نے ایک عجیب بے بسی کے عالم میں کہا: "مار لو۔"

"نہیں ماروں گا۔" مستان شاہ نے مشفقانہ سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور میرے کاندھوں پر پیار سے ہولے ہولے پانچ مکے مارے۔

"مولا حسینؓ کے نام پر اگر مَیں تم سے چندہ مانگوں، تو دو گے؟" اب وہ حرفِ مدعا زبان پر لے آیا تھا، مگر پیشتر اس کے کہ مَیں کوئی جواب دیتا اس نے گمبھیر آواز میں کہا: "نہیں لوں گا۔" اور پھر نجیب احمد کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں پنجتن کے نام پر زور سے پانچ مکے ماروں؟"

"مارو!" نجیب نے گلوگیر لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں ماروں گا!" اس نے کہا اور پھر اسے بھی پیار سے ہولے ہولے پانچ مکے مارے۔

"مولا حسینؓ کے نام پر اگر تم سے چندہ مانگوں تو دو گے؟" اس نے دوسرا سوال دہرایا اور پھر حسبِ سابق نجیب کے جواب سے پہلے خود ہی کہا: "نہیں لوں گا۔"

اور اب خالد احمد کی باری تھی۔ مستان شاہ نے پنجتن کے نام پر پانچ مکوں کی فرمائش اور پھر اثبات میں جواب ملنے پر "نہیں ماروں گا" کہہ کر دوسرا سوال دہرایا: "مولا حسینؓ کے نام پر اگر تم سے دس روپے مانگوں تو دو گے؟" خالد احمد نے اس کی طرف دیکھا کہ وہ ابھی خود ہی "نہیں لوں گا" کہہ دے گا، مگر جب اس نے ایسا نہ کیا، بلکہ ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا، تو خالد احمد نے بے بسی سے کہا: "ہاں دوں گا!"

"تو پھر نکالو!" مستان شاہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ خالد احمد نے بڑی تابعداری سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے نکال کر اسے دے دیے۔

"یہ تم اپنی خوشی سے دے رہے ہو۔ اگر خوشی سے نہیں دیے، تو واپس لے لو۔" مستان شاہ نے کہا، مگر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ نوٹ جیب میں ڈال چکا تھا۔

"فقیر اب تمہارے لیے دعا کرے گا۔" مستان شاہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس کے ساتھ ہم بھی دعا میں شریک ہو گئے۔ دعا کے بعد اس نے نوٹ بک بغل میں دبائی جس میں پولیس انسپکٹروں وغیرہ نے اس کی "ولایت" کی تصدیق کی تھی

اور دوسرے ہاتھ میں عصا تھام کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"یہ دعا کے لیے ہاتھ ہم نے تمہارے لیے نہیں اٹھائے تھے۔" اس کے جاتے ہی میرے منہ سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا "بلکہ یہ دعائے مغفرت تو اس دس کے نوٹ کے لیے تھی جس سے تم محروم ہو گئے ہو۔"

"ہاں یار میرے ساتھ تو واقعی ہاتھ ہو گیا ہے۔" بے روزگار خالد احمد نے جھینپی جھینپی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور اپنے بڑھے ہوئے شیو میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

"میں تو کہتا ہوں تم نوکریوں کے پیچھے دربدر ہونا چھوڑو اور مستان شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے یہی کام شروع کر دو۔" نجیب احمد نے کہا اور پھر ہم تینوں نے پیٹ پکڑ کر ہنسنا شروع کر دیا۔

مگر ہم تینوں کہ اندر سے کمزور اور سہمے ہوئے اور باہر سے پڑھے لکھے روشن خیال نوجوان تھے، ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہو گئے اور پھر ہمارے چہروں پر خوف کی لکیریں پھیلتی چلی گئیں۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی اور پھر ہم ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر اپنے ان گھروں کی طرف لوٹ گئے جن کے گرد غربت کی دیواریں ہیں اور جن پر ان دیکھے خوف کے سائے ہیں۔

غالب کے ساتھ

لاہور سے مری کی طرف سفر کے دوران میں نے اسد اللہ غالب کو اندھا دھند کار چلاتے دیکھا، تو پوچھا "مرشدی وہ آپ کا ایک بھلا سا شعر ہے، کیا ہے وہ؟

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

بولے: "ہاں شعر تو یہی ہے، مگر پوچھنے کی نوبت کیوں آئی؟"
میں نے سپیڈومیٹر پر ایک نظر ڈالی اور کہا "کچھ نہیں بس یوں ہی پوچھا تھا۔"

یہ اسد اللہ غالب، مرزا اسد اللہ غالب نہیں تھے، مگر قحط الرّجال کے اس دور میں ہم نے انہی کو غنیمت جانا اور لاہور سے مری مری سے منگلا، منگلا سے میرپور اور میرپور سے واپس لاہور آنے تک ہم نے انہیں مرزا غالب ہی قرار دیا اور اس دوران ان سے گفتگو اکثر و بیشتر "انہی" کے شعروں کے حوالے سے کرتے رہے۔

مری کی مال روڈ پر پھیرے لگا لگا کر جب میں امجد، گلزار، وجد اور غالب خود کو "بھائی پھیرو" محسوس کرنے لگے تو میں نے غالب سے پوچھا۔

"مرشدی اب کیا کیا جائے؟"

غالب نے جواب دیا۔ "اب پنڈی پوائنٹ چلا جائے۔"

پنڈی پوائنٹ کو چھو کر لوٹے، تو ایک بار پھر استفسار کیا کہ "حضرت اب کیا کیا جائے؟"

بولے: "اب کشمیر پوائنٹ تک واک کی جائے۔"

کشمیر پوائنٹ سے واپسی پر پوچھا: "اب کیا کیا جائے؟"

فرمایا: "اب پھر مال روڈ کے پھیرے لگائے جائیں!"

مال روڈ کی وہی اونچائیاں اور پھر وہی نچائیاں تھیں، وہی مرد اور وہی عورتیں تھیں، وہی دکانیں اور وہی دکاندار تھے یعنی وہی "تم" اور وہی "ہم" تھے۔

مرد و زن کے اس بے کراں ہجوم میں چلتے چلتے میں نے ایک بار پھر غالب سے پوچھا: "مرشدی! وہ آپ کا ایک بھلا سا شعر ہے، کیا ہے وہ؟

؎ دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

گھبرا کر بولے: "ہاں شعر تو یہی ہے، مگر پوچھنے کی نوبت کیوں آئی؟" میں نے کہا: "کچھ نہیں، بس یونہی پوچھا تھا!"

چھ ہزار فٹ بلندی پر چلتے چلتے امجد اسلام اور گلزار وفا ایک جگہ سانس لینے کے لیے رُکے اور پھر ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ ریلنگ کے پیچھے دور تک پھیلے ہوئے چیڑ کے درختوں کا ہجوم تھا جو ڈھلوان پہاڑیوں کے ساتھ نیچے اترتا جا رہا تھا ــــــ اور پھر نظروں کے سامنے پتلی لکیر ایسی

سڑک بھتی جو راولپنڈی کی طرف لڑھکتی جارہی بھتی۔

"واپسی پر تو اُترائی ہی اترائی ہے، جلدی پہنچ جائیں گے؟" گلزار دفا نے پتلی کمر یا ایسی سڑک پر ایک نظر ڈالتے ہوئے استفہامی انداز میں کہا۔

"ہاں بہت جلدی۔" امجد نے جواب دیا۔ "بلکہ سائنس نے تو اتنی ترقی کر لی ہے کہ اگر تم چاہو، تو آنکھ جھپکنے میں پنڈی پہنچ سکتے ہو۔ بس اس کے لیے تمہیں ایک پیشگی تحریر لکھ کر ہمیں دینا ہو گی۔ کیا خیال ہے؟"

جواب میں گلزار نے ریلنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

غالب اور وحید چہل قدمی کرتے کرتے کافی آگے نکل گئے بھتے۔ گلزار نے وہیں کھڑے کھڑے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر انہیں تلاش کیا اور جب وہ دکھائی نہ دیئے تو کہا۔ "ہمیں بھی چلنا چاہیے۔"

"مری میں کوئی کسی سے نہیں بچھڑتا۔ یہاں تو بچھڑے ہوئے ملتے ہیں۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم نے اِس پاگل کی حکایت تو سُنی ہے نا جسے کسی نے پتھر مارا تو وہ قبرستان میں جا کر بیٹھ گیا کہ اسے پتھر مارنے والا بالآخر یہیں آئیگا۔ مری میں بھی جن لوگوں سے ملنا ہو، یہاں مال روڈ پر کھڑے رہو کہ بالآخر سبھی یہاں آئیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آگئے۔

غالب کے ہاتھیں کپاس سے ملتے جلتے کچھ ملائم سے ریشے بھتے۔ "حضرات! یہ سنبل ہے جس کی شاعری میں بہت دھومیں ہیں۔ ذرا آگے جا کر دیکھیے، اس کے ریشے فضاؤں میں اُڑ رہے ہیں جس پر ریشہ خطمی ہوتے ہیں، اس کی آنکھوں میں گھستے چلے جاتے ہیں۔" غالب نے سنبل کا قصیدہ بجوبہ پڑھتے ہوئے کہا۔ "اور

حضرات اُردو فارسی شاعری میں سنبل کے ساتھ ریحان کا ذکر بھی بہت آتا ہے۔ کیا وہ حضرت بھی کچھ اسی قسم کی چیز ہیں"۔

بعد میں ہم نے لغت دیکھی تو پتہ چلا کہ سنبل کوئی اور چیز ہوتی ہے۔

واپسی پر اسی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے غالب نے ایک جگہ کار کو بریک لگائی اور کہا: "میں آپ کو یہ اطلاع بہم پہنچانا چاہتا ہوں کہ کار کی ہینڈ بریک درست نہیں ہے اور ظاہر ہے اترائی میں اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ مجھے یہ اطلاع مری کی پہاڑیاں چڑھتے ہوئے آپ کو دینا چاہیے تھی۔ میں اطلاع میں اس تاخیر پر معذرت چاہتا ہوں"۔

مری کی پہاڑیاں اترنے کے بعد غالب نے ایک بار پھر کار روکی اور کہا:

"حضرات! ذرا گردن موڑ کر یہاں سے ان بلند و بالا پہاڑوں پر ایک نظر دوڑائیں جہاں سے ابھی لوٹے ہیں، ان ہزاروں فٹ گہرے کھڈوں کو بھی ذہن میں لائیں جو ان راہوں میں موجود ہیں اور پھر ایک اطلاع یہ سُنیں کہ کار کے چار پہیّوں میں سے دو پہیوں کا سائز کچھ اور ہے اور دو پہیّوں کا سائز کچھ اور ہے لاہور سے روانہ ہوتے وقت میں بوجہ مصروفیّت ٹائر بدلوا نہیں سکا تھا۔ میں اطلاع میں اس تاخیر پر بھی معذرت چاہتا ہوں اور گذارش کرتا ہوں کہ آپ ایک بار پھر ان بلند و بالا پہاڑوں پہ ایک نظر دوڑائیں جہاں سے ہم ابھی لوٹے ہیں"۔

کار میں سنّاٹا چھا گیا!

تھوڑی دیر بعد میں نے اس سنّاٹے کو توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے غالب سے پوچھا: "مرشدی! وہ آپ کا ایک بھلا سا شعر ہے، کیا ہے وہ؟

؎ سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

بولے: "ہاں شعر تو یہی ہے، مگر پوچھنے کی نوبت کیوں آئی؟"

مَیں نے گردن موڑ کر بلند و بالا پہاڑوں پر ایک نظر ڈالی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا: "نہیں بس یونہی پوچھا تھا۔"

پختونستان ہوٹل

جنوری ۱۹۷۰ء میں کابل (اور یورپ) کی یخ بستہ سردی کا تصور کر کے جب میں لاہور سے کابل اور پھر آگے یورپ جانے کے لیے پی آئی اے کے طیارے میں سوار ہونے لگا، تو خود مجھے اپنی ہیئت کذائی پر ہنسی آ گئی۔ اونی بنیان، بنیان کے اوپر سویٹر، سویٹر کے اوپر قمیص، قمیص کے اوپر پھر سویٹر، سویٹر پر کوٹ اور کوٹ پر اوور کوٹ۔ پاؤں میں ایک کے بجائے جرابوں کے دو جوڑے، نیچے لیگنگ اور پھر گرم پتلون! اگر ان دنوں بھی ایئرپورٹ پر مسافروں کی تلاشی کا موجودہ "مخش" طریق کار ہی رائج ہوتا، تو دو صورتوں میں سے ایک صورت ممکن تھی کہ یا تو اس روز یہ پرواز کابل کے لیے روانہ ہوتی اور یا پھر میری جامہ تلاشی کا مرحلہ مکمل ہوتا۔ بہر حال طیارے میں ہیٹنگ سسٹم کی موجودگی کے باعث کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے جسم میں آگ سی بھڑکتی محسوس ہوئی۔ لیکن میرا رفیقِ نشست آتشِ شوق میں جل رہا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ایئر ہوسٹس اپنی مسکراہٹ تیز کر کے ہمارے پاس پہنچی اور پوچھا: "آپ کیا پئیں گے؟"

"جوس!" دریں حالات جوس ہی میرے جسم کی آگ کو سرد کر سکتا تھا!

"اور آپ؟" اس نے میرے رفیقِ نشست سے پوچھا۔ جو بڑے خشوع و خضوع سے والہانہ انداز میں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھے جا رہا تھا!

"میں ؟" میرے رفیق نے عینک اتاردی - ہا ... ہا ... ہا "

یہ " ہا - ہا - ہا " غالباً جہاز میں دستیاب نہیں تھا، چنانچہ ایئر ہوسٹس نے اپنی کند ہوتی مسکراہٹ کو دوبارہ سان پر لگایا اور اپنا سوال دہراتے ہوئے پوچھا کہ وہ کیا پئیں گے ؟

"آپ ضرور کچھ پلانا چاہتی ہیں ؟" اس عاشق زاد نے رومال سے اپنی عینک کے شیشے صاف کیے اور پھر رومان میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا " جو چاہیں پلا دیں ، ہم پی لیں گے "

میں اپنے جوس سے بھی محروم ہو گیا تھا ، کیونکہ وہ ایئر ہوسٹس پھر لوٹ کر نہیں آئی -

کابل برف سے اٹا ہوا تھا - گلی کوچوں میں جمی ہوئی برف پر میں احتیاط سے قدم جماتا ہوا الو اشیر محمد حسین کا گھر ڈھونڈ رہا تھا جس کا پتہ مجھے لاہور میں ایک دوست نے دیا تھا جو اس افغانی کا قریبی عزیز تھا - اوپر شٹل کاک برقعہ اور نیچے سکرٹ پہنے ہوئے ایک افغانی خاتون میرے برابر سے گزری ، مگر میں نے دیارِ غیر میں اس سے ایڈریس پوچھنے کا رسک نہ لیا - ناگاہ میری نظر اس سنسان گلی میں ایک سرد و سرو قد پر پڑی جس نے ترکستانیوں جیسی ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا - اس نے میرے استفسار پر گلی سے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برفیلی ڈھلان پر اتر گیا - میری دستک پر مکان کی دوسری منزل میں سے قندھاری انار ایسی ایک خاتون نے کھڑکی میں سے اپنا سر باہر نکالا اور میرے استفسار پر اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا ، اس نے غصے سے کہا " وہ حرام زادہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے - وہ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ اب

ایک اور مکان میں رہتا ہے" اور اس کے ساتھ ہی اس نے زور سے کھڑکی بند کر دی۔

مَیں پریشان ہو کر چلنے ہی کو تھا کہ کھڑکی ایک بار پھر کھلی اور اس سُرخ و سفید خاتون نے سر باہر نکال کر کہا "تم مہمان لگتے ہو۔ مَیں اپنا ملازم تمہارے ساتھ بھیجتی ہوں وہ تمہیں اِس خنزیر کے گھر چھوڑ آئے گا"۔

مَیں نے اپنے میزبان کو (جس کا "ابتدائی تعارف" اس کی سابقہ بیوی نے کرایا تھا) اس کے عزیز کا رقعہ دیا تو اس نے پُر جوش طریقے سے میرا خیر مقدم کیا اور اپنے گھر کے دروازے میرے لیے وا کر دیے۔ یہ ہنس مُکھ شخص مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خورد و نوش کا انتظام کرنے کے لیے خود اندر چلا گیا۔

ڈرائنگ روم کی آرائش سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نفیس ذوق رکھنے کے علاوہ خاصا متمول بھی ہے۔ یہ کمرہ بھاپ والے پائپوں سے گرم کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں کچھ دیر بعد جسم پر استوار کئی "منزلہ" کپڑوں کی "عمارت" مجھے بار لگنے لگی؛ چنانچہ مَیں نے تمام زائد کپڑے اتار دیے اور صرف پتلون اور قمیص پہن کر نرم نرم صوفے پر دراز ہو گیا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور میزبان کی نظر قالین پر پڑے کپڑوں کے ڈھیر پر گئی، تو اس نے بھرپور قہقہہ لگایا اور افغانی لہجے کی اردو میں کہا: "یہ سب کپڑے تم نے اتارے ہیں۔ مَیں نہیں مانتا۔ یہ سارے کپڑے ایک دفعہ پھر مجھے پہن کر دکھاؤ"۔

اور کابل میں اُردو بولنے والے افغانی مجھے وافر تعداد میں ملے، ایک عمارت کے باہر "پختونستان ہوٹل" کا بورڈ لگا دیکھ کر میرا جذبۂ تجسس بیدار ہوا اور میں اس میلے کچیلے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ یہاں لتا اور رفیع کے گانوں کے ریکارڈ بجائے جا رہے تھے اور اس پُر شور فضا میں چوڑی چکلی چھاتیوں اور چہروں والے

افغانی کرسیوں پر اکڑوں بیٹھے ہوئے چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ میرے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک گاہک نے مجھ سے اردو میں پوچھا: "تم پاکستان سے آئے ہو؟"

"ہاں!" میں نے مختصر سا جواب دیا اور قہوے کی چسکیاں لینے لگا۔

"برادر ملک۔ برادر ملک!" اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے افغانی نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے "السلام علیکم" کے ساتھ ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ میں قہوہ پی کر "بل" کی ادائیگی کے لیے کاؤنٹر کی طرف جانے لگا، تو ان میں سے ایک نے مجھے روک دیا: "تم پیسہ نہیں دو گے' تم پاکستان سے آئے ہو!"

میں نے ہوٹل سے نکل کر ایک نظر باہر آویزاں "پختونستان ہوٹل" پر ڈالی، ایک نظر اندر بیٹھے ہوئے پُرخلوص عوام کو دیکھا اور پھر پوچھتا پچھاتا واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا جہاں میرا میزبان کھانے کی میز پر میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے ایک بار پھر کپڑوں کے ڈھیر تلے دبا دیکھ کر بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا: "میں دوسرے کمرے میں جاتا ہوں' تم اتنی دیر میں اپنی "پیکنگ" کھول کر ذرا آرام کر لو!"

مسافتیں

سرہند شریف میں حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کے عرس کی تقریبات اختتام پذیر ہوئیں تو اگلے روز قریباً ایک سو پاکستانی زائرین پر مشتمل وفد سرہند سے قریباً ۲۰ کلومیٹر پر واقع ایک قصبہ براس کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک روایت کے مطابق بعض انبیائے کرام مدفون ہیں۔ زائرین کے لیے دو بسیں مخصوص کی گئی تھیں مگر اس کے باوجود زائرین ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے بس میں سوار ہو رہے تھے۔ مسافروں میں زائرین پر متعین بھارتی انٹیلی جنس کی فوج ظفر موج کے کچھ "معزز ارکان" بھی شامل تھے۔ مجھے ان میں سے خصوصاً وہ "صوفی صاحب" بہت دلچسپ لگے تھے جنہوں نے لمبی داڑھی اور زلفیں رکھی ہوئی تھیں۔ سر پر گول ٹوپی تھی اور جو گزشتہ دو دنوں سے خصوصی طور پر مجھ سے "اظہارِ محبت" فرما رہے تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف سہارنپور کے ایک بہت بڑے تاجر کے طور پر کرایا تھا اور "مور اوور" کے طور پر یہ بتایا تھا کہ وہ شاعر بھی ہیں، چنانچہ انہوں نے گزشتہ رات ترنم سے اپنی کچھ بے وزن غزلیں بھی سنائی تھیں۔ ان صوفی صاحب کی حقیقت مجھ پر اس وقت آشکار ہوئی جب دو روز قبل رات کو میری طبیعت خراب ہو گئی اور میں ابکائی کے لیے اپنے حجرے سے باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مزار کے باہر عارضی طور پر قائم شدہ

ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میرے حلق سے نکلنے والی آوازیں سن کر ان کی آنکھ کھل گئی اور وہ فوراً جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگے۔ ابکائی سے فارغ ہو کر میں نے ان سے کہا "حضرت! آپ اتنی سردی میں باہر بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟" فرمایا "بس نیند نہیں آ رہی تھی، یونہی ادھر چلا آیا" اور یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں ایک بار پھر بند ہو گئیں۔ اس کے بعد رات کے دو بجے میں نے انہیں اسی طرح تھڑے پر بیٹھے اونگھتے دیکھا اور پھر صبح چار بجے بھی وہ نیند نہ آنے کی وجہ سے "تھڑے پر مراقبے کے عالم میں تشریف فرما تھے اور اس وقت وہ پاکستانی زائرین کے لیے مخصوص بسوں میں سے ایک بس میں سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے "کھنگورا" مار کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ آواز ان تک نہ پہنچی شاید اس لیے کہ فروری کے مہینے میں چار پانچ روز تک فرش پر سونے کی وجہ سے کھنگورے میں وہ دم خم نہیں رہا تھا!

میری نشست پاکستانی وفد کے قائد مسٹر جسٹس صدیق چودھری کے ساتھ تھی۔ کھردری لکڑی سے تیار شدہ جسٹس صاحب کا عصا اس وقت بھی ان کے ہمراہ تھا۔ بس اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی تو جسٹس صاحب (جواب ریٹائر ہو چکے ہیں) نے اپنے خالص دیہاتی لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ میرے لیے ان کی یہ گفتگو حقیقتوں کا عرفان تھی۔ جسٹس صاحب قیام پاکستان کے بعد مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لیے قائم شدہ کمیشن کے رکن تھے اور اس عرصے میں انہوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے فرائض انجام دیے تھے۔ وہ بتا رہے تھے: "اس وقت تم سڑک کے دونوں جانب جو ہرے بھرے کھیت

دیکھ رہے ہو، ۱۹۴۷ء میں یہاں مسلمان عورتوں، مردوں اور بچوں کے سروں کی سرخ فصلیں کاٹی گئی تھیں۔ تم نے عورت کے کئی روپ دیکھے ہوں گے مگر اس کی بیچارگی اور مظلومیت کا رخ شاید اس طرح نہ دیکھا ہو جس طرح میں نے دیکھا ہے۔ جب مجھے پتہ چلتا کہ کسی گاؤں میں مسلمان عورتیں درندوں کے قبضے میں ہیں تو میں پولیس کے چند سپاہیوں کے ساتھ خون کے پیاسے افراد کے درمیان میں سے گزر کر ان تک پہنچتا۔ مگر کئی بار یوں ہوا کہ مغویہ ہمیں دیکھ کر ہمارے ساتھ چلنے کی بجائے اس وحشی کے پہلو میں جا کھڑی ہوتی جس نے اس کے والدین کو قتل کر دیا تھا اور اسے اٹھا کر اپنے گھر ڈال لیا تھا۔ لیکن جب ہم اسے یقین دلاتے کہ اب وہ مکمل طور پر محفوظ ہے اور اسے اس غنڈے سے ڈرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تو وہ ہمارے ساتھ چلنے پر رضامند ہوتی اور پھر مغویہ عورتوں کے کیمپ میں پہنچ کر وہ اپنے بچے کھچے کسی عزیز کے گلے لگ کر ہچکیاں لے کر روتی۔"

جسٹس صاحب نے بتایا۔ "میری آنکھوں نے وہ خون آشام مناظر دیکھے ہیں کہ ایک وقت میں انسانیت سے میرا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ اپنے فرائض کی بجا آوری کے دوران میری ملاقات ان بچیوں سے بھی ہوئی جو پورے پورے گاؤں کی ملکیت تھیں۔ میں نے کیمپوں میں اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور پھولے ہوئے پیٹ دیکھے ہیں۔ یہ اس وقت ہم جس علاقے سے گزر رہے ہیں یہاں سے مسلمان عورتوں کے برہنہ جلوس گزرتے رہے ہیں!"

"مگر میں تمہیں ایک واقعہ ضرور سناؤں گا۔" جسٹس صاحب نے کہا۔ "مجھے اطلاع ملی کہ ایک سیدزادی کو ایک بھنگی نے اپنے گھر ڈالا ہوا ہے۔ میں پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ اس گاؤں میں پہنچا اور دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا صحن میں ایک بچی کھانا پکا رہی تھی اور ایک طرف جلتے ہوئے

بچھی تھی؛ اتنے میں ایک دوسرے کمرے سے ایک ادھیڑ عمر کا کالا بھجنگا شخص باہر نکلا اور ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی بھنگی تھا جس کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ اس نے ایک سیدزادی کو اغوا کر کے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار گھونسہ اس کے منہ پر رسید کیا جس سے وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اٹھا اور اپنی قمیص کے دامن سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے اس نے کھانا پکاتی ہوئی لڑکی کی اشارہ کر کے نحیف سی آواز میں کہا: "تم اسے لینے آئے ہو؟" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ وہ سیدھا لڑکی کی طرف گیا اور کہا: "بیٹی! میرے پاس تمہیں الوداع کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پوٹلی میں ایک دوپٹہ ہے اور تھوڑا سا گڑ ہے۔ میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ سکھی رہو۔" اور پھر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

بس تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ براس کا قصبہ ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ جب ہم یہاں پہنچے تو مٹی کے بنے ہوئے گھروں میں سے بے شمار بچے اچانک نکلے اور ہماری بس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس گاؤں میں زیادہ تعداد سکھوں کی تھی چنانچہ ننھے ننھے بچوں نے سروں پر جُوڑے کیے ہوئے تھے اور وہ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ زائرین بسوں میں سے اترے اور قدرے بلندی پر واقع اس چار دیواری میں داخل ہو گئے جہاں ایک روایت کے مطابق بعض انبیائے کرام مدفون ہیں۔ یہاں کئی کئی گز لمبی دو تین قبریں تھیں

جو مبینہ طور پر ان انبیا کی تھیں زائرین نے یہاں قرآن مجید کی تلاوت کی اور دعا مانگی۔
دعا سے فراغت کے بعد بسوں کی طرف واپس جانے کے لیے ڈھلان سے اترتے
ہوئے اچانک ایک دُبلا پتلا سا ہندو ہمارے وفد کے قائد جسٹس صدیق چودھری
کے پاس آیا اور اس کے کان میں کچھ کہا اور پھر وہ شخص زائرین کے آگے آگے چلنے
لگا جسٹس صاحب نے ہمیں بتایا کہ یہ ہندو انہیں بتا کر گیا ہے کہ سکھوں نے
اس گاؤں میں بہت وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔ انہوں نے سینکڑوں
مسلمان عورتوں کی عصمت دری کی تھی، بے شمار مسلمان عورتوں کو انہوں نے اپنے
گھر میں قید کر لیا تھا جو آج بھی انہی گھروں میں بند ہیں اور ان کے بچوں کی
مائیں ہیں۔ نیز یہ کہ سینکڑوں مسلمان لڑکیوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے
کنوؤں میں چھلانگیں لگا دی تھیں اور یہ کنوئیں ان کی لاشوں سے پٹ گئے تھے۔
ان میں سے تین کنوئیں اس کے علم میں ہیں اور وہ ان کی نشاندہی کرنا چاہتا ہے
یہ خبر آگ کی طرح زائرین میں پھیل گئی اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس
شخص کے پیچھے چلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ہموار جگہ پر رک گیا جہاں خودرو
پھول لہلہا رہے تھے۔ ان پھولوں کے نیچے کنواں تھا جو بند ہو چکا تھا اور جس میں
مسلمان لڑکیاں دفن تھیں۔ یہاں فاتحہ خوانی کرنے کے بعد زائرین کا یہ قافلہ ایک
کچے مکان کے قریب جا کر رکا۔ اس مکان کی صحن کی دیوار کے نیچے دوسرا کنواں
تھا جو مسلمان لڑکیوں کی لاشوں سے بھرا ہوا تھا اور اب اسے بھی بند کیا جا چکا
تھا۔ یہاں بھی فاتحہ خوانی کی گئی۔ تیسرا کنواں بہت سارے گھروں کے درمیان میں
واقع تھا اور یہ اپنی اصل شکل میں موجود تھا۔ اسے بند نہیں کیا گیا تھا لیکن لاشوں
سے پٹ جانے کی وجہ سے چونکہ اس کا پانی پینے کے قابل نہیں رہا تھا، لہٰذا اب

اس میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے ضبط کے سبھی بندھن ٹوٹ چکے تھے۔ غم کی شدت سے زائرین کے کلیجے شق تھے اور آنکھیں ساون کی طرح برس رہی تھیں۔ خود مجھے یوں لگا ہیں ۱۹۷۷ کی بجائے ۱۹۴۷ میں سانس لے رہا ہوں۔ میں نے چشمِ تصور میں دیکھا کہ جوان مردوں اور بوڑھی عورتوں کی لاشوں سے یہ میدان اٹا پڑا ہے اور وحشی درندے شراب کے نشے میں دھت بھیانک قہقہے لگاتے ہوئے بچیوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور وہ اپنے والدین اور عزیز و اقربا کی لاشوں کو پھلانگتی ہوئی اس کنوئیں کے پاس آتی ہیں اور ایک ایک کر کے اس میں چھلانگ لگا دیتی ہیں۔ یہ کنواں لاشوں سے بھر گیا ہے اور اس کا پانی کناروں سے بہنے لگا ہے اور پھر یہ بہتا ہوا پانی فریاد کے لیے اس چار دیواری کے نیچے جمع ہو گیا ہے جہاں انبیا کے مزار ہیں۔

یہاں وفد میں شامل ایک باریش بزرگ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پھر جوں جوں ان کی ہچکیوں بھری آواز بلند ہوتی گئی زائرین کی آہ و بکا میں شدت آتی گئی اور پھر روتے روتے گلے رندھ گئے۔ بھائی تیس برس بعد اپنی بہنوں کی خبر لینے آئے تھے اور پل بھر کے بعد انہوں نے پھر سے جدا ہو جانا تھا۔ ارد گرد کے مکانوں سے بہت سی ہندو اور سکھ عورتیں بھی ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر یہ دلخراش منظر دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے پلو آنکھوں پر رکھ لیے تھے اور ان میں سے ایک عورت کو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر شدید کرب تھا اور وہ ایک ایک زائر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بے اختیار ہو کر اس نے ایک چیخ ماری اور پھر وہ بھاگ کر نظر دل سے اوجھل

ہو گئی۔ مجھے لگا یہ عورت ان میں سے ایک ہے جن کے پیٹ پھولے ہوئے ہیں اور آنکھیں تارے لگی ہوئی ہیں۔

دعا سے فراغت کے بعد سندھ یونیورسٹی کے ایک نوجوان نے مجھ سے کہا: "یہاں آنے سے پہلے میں اکھنڈ بھارت کا قائل تھا اور سمجھتا تھا کہ دو قومی نظریہ غلط ہے۔ میری یہ گزارش ہے کہ آپ واپس جائیں تو یہ تجویز پیش کریں کہ جو لوگ اپنے دلوں میں پاکستان کے حوالے سے کچھ شکوک و شبہات رکھتے ہیں انہیں یہاں لاکر یہ کنوئیں دکھائے جائیں۔ یہ خونچکاں منظر نئی نسل کے ان افراد کو خصوصاً دکھائے جائیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان تاریخی عوامل کے بغیر بنا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جنم لینے والی نسل کے افراد یہ کنوئیں دیکھ کر جان جائیں گے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے دارالامان پاکستان کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں اور وہ یہ بھی جان جائیں گے کہ اگر اس ملک پر آنچ آتی ہے تو تلواریں ایک بار پھر ہوا میں لہرائیں گی اور بہنوں کی چیخ و پکار اندھے کنوؤں میں دم توڑ دے گی۔ اس سندھی نوجوان نے کہا کہ یہ کنوئیں ان بدنیت دانشوروں کو بھی دکھائیں جو پاکستانی قوم کے لیے یہ کنوئیں دوبارہ کھودنا چاہتے ہیں۔

واپسی پر ہندو اور سکھ بچے ایک بار پھر ہماری بسوں کے گرد جمع ہو گئے تھے اور معصوم نگاہوں سے ہمارے مغموم چہروں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان میں سے تین چار سال کے ایک پیارے سے بچے کو گود میں اٹھایا اور اس کے گالوں پر بوسہ دیتے ہوئے بزبانِ حال کہا بیٹے تم تو معصوم ہو، یہ کنوئیں بھی معصوموں کی لاشوں سے پٹے ہوئے ہیں۔ اگر تاریک طوفانی راتوں میں تم ان کنوؤں سے یہ چیخیں سنو تو ان پر کان ضرور دھرنا۔ ہم یہ امانتیں تمہارے بڑوں کی بجائے تمہارے سپرد کر رہے ہیں کہ بچے اس دنیا میں خدا کے سفیر ہوتے ہیں۔"

بھیرویں سے مالکونس تک

گزشتہ سال کے پہلے ہفتے میں جب میں، بیدار اور انعام سرگودھا پہنچے تو گورنمنٹ کالج کے وسیع و عریض کیمپس کو عبور کرتے ہوئے بیدار اساتذہ کی رہائش گاہ میں سے ایک رہائش گاہ کے سامنے جا رکے۔ دروازے پر لگی بیل پر انگلی رکھی جس پر ڈرائنگ روم کے دو دروازوں میں سے پہلا دروازہ کھلا اور پھر کسی نے جالی والے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی آواز آئی "اخاہ! بیدار صاحب، آپ ذرا برآمدے میں تشریف رکھیں، میں ابھی حاضر ہُوا۔" اس پر بیدار نے مجھے کہا "یہ حضرت خلیل بدایونی ہیں۔ اسی کالج میں پرنسپل تھے حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔ بڑے وضعدار بزرگ ہیں۔ یہ مہمانوں کے سامنے باقاعدہ تیار ہو کر آئیں گے۔ تبھی ہمیں انتظار کے لیے کہہ گئے ہیں" اور واقعی جب حضرت خلیل بدایونی تھوڑی دیر بعد دروازے میں نمودار ہوئے تو وہ تھری پیس سُوٹ، ٹائی اور ٹوپی میں ملبوس تھے انھوں نے ہمارے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور ہمارے ساتھ صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس پر میں نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ منحنی سا جسم، بوٹا سا قد، آنکھوں پر

چشم اور چہرے پر معصومیت کی ریل پیل۔ بیدار نے میرے کان میں کہا: "خلیل صاحب کو ہزاروں شعر یاد ہیں اور ایک نشست میں سینکڑوں شعر سنا ڈالتے ہیں۔ ابھی تو انہوں نے صرف سٹارٹ لیا ہے۔" حضرت خلیل بدایونی نے ہمیں یوں سرگوشی کرتے دیکھا تو مسکرا کر بولے۔ ؎

عجب کچھ لطف دیتا ہے شب خلوت میں دلبر سوں
سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

بیدار بھی جواباً مسکرائے اور کہا: "حضرت آپ کے مزاج کیسے ہیں؟" اس پر حضرت خلیل بدایونی نے ایک آہ بھری اور کہا: ؎

کچھ اس ادا سے آپ نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

بیدار نے یہ شعر سنا اَن سنا کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ خلیل صاحب سے اُن کے پرانے تعلقات ہیں جس پر خلیل صاحب نے بڑی محبت سے ان کے بیان کی تصدیق کی اور پھر یہ شعر سنایا۔ ؎

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اس دوران مجھے اس بزرگ سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ اس بار مَیں نے انہیں براہِ راست مخاطب کیا اور کہا: حضرت! آپ کو صرف دوسروں کے ہی اشعار یاد ہیں یا آپ خود بھی شعر کہتے ہیں؟" یہ سُن کر حضرت خلیل بدایونی نے تبسّم کیا اور فرمایا: ع

عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں

اساتذہ کے اشعار بھی یاد ہیں خود بھی شعر کہہ لیتا ہوں، تاہم ؎

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری

وگرنہ شعر میرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

اس دوران خلیل بدایونی نے اچانک چونک کر گھڑی دیکھی اور کہا۔ "آپ اتنی دیر سے تشریف فرما ہیں آپ کی تواضع ہی نہیں کر سکا۔ میاں نشاط! ذرا ٹیپ ریکارڈ لیتے آنا۔ صبح کا وقت ہے۔ آپ بھیرویں سے تو شوق فرمائیں گے نا؟" اور پھر ان کے صاحبزادے ٹیپ ریکارڈ اٹھا لائے اور خلیل بدایونی نے ٹیپ آن کر دیا۔ موصوف اپنی غزل بھیرویں میں گا رہے تھے پھر یوں ہوا کہ انہوں نے ٹیپ بند کی اور کہا۔ ایک تازہ غزل بھیرویں میں عرض کرتا ہوں لیکن انہوں نے ابھی کان پر ہاتھ رکھ کر پہلی تان ہی لگائی تھی کہ انعام کو چائے پیتے پیتے "اچھو" آ گیا اور وہ کپ میز پر رکھ کر باہر کو بھاگے، بیدار ان کے پیچھے تھے اور کچھ دیر بعد میں بھی باہر آ گیا، یہ عجیب اتفاق کہ ہم تینوں کو بیک وقت اچھو ہوا تاہم چند لمحوں بعد ہم ایک ایک کر کے واپس آ گئے۔ حضرت خلیل کے چہرے پر وہی معصومیت کی ریل پیل تھی۔

"خلیل صاحب صرف شاعر ہی نہیں، موسیقار ہی نہیں، بلکہ باغبانی، فلکیات، دشت شناسی، علم ہیئت اور دیگر بہت سے علوم و فنون میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔" بیدار نے ہمیں بتایا۔

"اجی نہیں صاحب یہ تو ان کی ذرہ نوازی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم بس اتنا ہے کہ ان علوم کا شوق رکھتا ہوں۔ گزشتہ دنوں میں نے ایک مسئلے پر حکومت کو خط لکھا کہ آپ ہیئت دانی کے حوالے سے میری خدمات حاصل کیجیے۔

تھرڈ کلاس میں اسلام آباد جاؤں گا، دال روٹی کھاؤں گا مگر فیس ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہو گی۔ اگر مستقبل میں میری بات درست ثابت ہوئی تو ڈیڑھ لاکھ روپیہ وصول کر لوں گا۔ بصورت دیگر یہ رقم لٹا دوں گا، مگر صاحب اس کی نوبت ہی نہیں آئی، تاہم میں نے جو نتیجہ اخذ کر کے اپنے طور پر قلمبند کیا تھا، صاحب وہ لفظ بہ لفظ درست نکلا۔"

"بہت اچھے" میں نے ان کی گفتگو کے اختتام پر کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنا ہاتھ ان کی طرف پھیلا دیا۔ "ذرا ایک نظر اس پر بھی ڈالیے اور بتائیے کہ عمر عزیز کے کتنے سال باقی رہ گئے ہیں؟"

"نشاط میاں! ذرا محدب شیشہ لائیے۔" خلیل صاحب نے صاحبزادے کو آواز دی اور پھر انہوں نے میرا ہاتھ ٹٹولنا شروع کر دیا۔ تاریخ پیدائش پوچھی، ایک کاغذ پر میرے دستخط لیے اور محدب شیشے سے لکیروں کا معائنہ فرمانے کے بعد عینک اتار کر ایک طرف رکھ دی۔

"صاحب آپ اس سوال کے علاوہ کوئی اور سوال پوچھیے۔" خلیل صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل ایک دفعہ میں نے اپنے ایک دوست جو سول جج تھے کا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ اس مہینے تمہاری موت واقع ہو جائے گی۔ صاحب خدا جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی کہ اسی مہینے ان کی وفات کا تار موصول ہو گیا آپ بھی اس مہینے ذرا محتاط رہیں ویسے اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا کرے

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہ سُن کر میرے پسینے چھوٹ گئے اور پھر مَیں نے ان سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہ کیا!

باہر برآمدے میں مختلف پھولوں اور پودوں کے سینکڑوں گملے دھرے تھے۔ خلیل صاحب نے ہمیں رخصت کرتے ہوئے چند پودوں کی ماہیت اور خاصیت کے بارے میں بتایا اور پھر ایک گملے میں سے ایک پتہ توڑتے ہوئے بیدار کو پیش کیا اور کہا "برگِ سبز است تحفۂ درویش!" بیدار نے اسے کوٹ میں سجانا چاہا تو خلیل صاحب نے کہا "نہ نہ صاحب یہ لیونڈر کا پتہ ہے اسے صرف سونگھیے جب خوشبو کم ہونے لگے تو اس پر پانی چھڑکیے یہ پھر سے خوشبو دینے لگے گا!"

بیدار نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر رخصتی سے قبل ہاتھ ملاتے ہوئے پیشتر اس کے کہ وہ کوئی شعر پڑھتے مَیں نے انہیں مخاطب کر کے کہا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو مِیرؔ سے صحبت نہیں رہی

اور اس کے ساتھ ہم ایک ایک کر کے کوٹھی کے مین گیٹ سے باہر نکل آئے کہ شام ہونے کو تھی۔ یعنی بھیرویں کے بعد اب مالکونس کا وقت قریب تھا!!!

اُوپر، نیچے، درمیان

مری میں ابھی سیزن کا آغاز نہیں ہوا تھا، مگر آج اتوار کی وجہ سے خاصی چہل پہل تھی۔ کچھ "زائرین" راولپنڈی کے تھے جو بھیگے ہوئے موسم کا مزہ لینے کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے اور ایک بڑی تعداد اسلام آباد میں "آباد" غیرملکی ڈپلومیٹس کی تھی جو اپنے بال بچوں سمیت یہاں نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر صفدر محمود اور منصور قیصر کے ساتھ کشمیر پوائنٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے منصور قیصر سے کہا: "میرے کان بند ہو چکے ہیں، کوئی نسخہ بتاؤ۔" منصور قیصر نے کہا: "جب انسان بلندی پر پہنچتا ہے، تو اس کے کان بند ہو جاتے ہیں، اسے کچھ سنائی نہیں دیتا، سو حیرانی کی کوئی بات نہیں۔" اتنے میں کشمیر پوائنٹ کی طرف مڑتے ہوئے دائیں ہاتھ پر واقع دکانوں کی بالائی منزل سے بلند آہنگ نعرے سنائی دیے "زندہ باد" "مُردہ باد"۔ غالباً اوپر کوئی اجلاس ہو رہا تھا اور کارکن نعرے لگا رہے تھے۔ منصور قیصر نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا: "تمہیں تو یہ نعرے بھی سنائی نہیں دے رہے ہوں گے۔"

"سنائی دے رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا "مگر میں چھ ہزار فٹ کی بلندی پر یہ نعرے سننے کے لیے نہیں آیا۔ آگے بڑھو۔"

اتنے میں لوگوں نے دکانیں بند کرنا شروع کر دی تھیں اور کاروں والے

اپنی کاروں کے بارے میں متفکر نظر آنے لگے تھے۔ شاید اجلاس ختم ہونے کو تھا اور اب اس کے شرکا جلوس کی صورت میں مال پر آنے والے تھے۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کی اور کشمیر پوائنٹ کی طرف مڑ گئے ــــــ دائیں ہاتھ ریلنگ پر ایک آٹھ نو سال کا گول مٹول بچہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بیٹھا تھا۔ سینکڑوں فٹ نیچے وادی میں مٹی کے گھروندے نقطوں کی مانند بکھرے نظر آ رہے تھے۔ بچے کے چہرے پر ایک خاموش مسکراہٹ تھی اور وہ کیمرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا، یہ کیمرہ ایک زرد رُو جاپانی کے ہاتھ میں تھا جو اس بچے کی تصویر بنانے میں مشغول تھا۔ "ٹک" کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی بچے کے چہرے سے مسکراہٹ ہو گئی۔ ان امیر وادیوں کے غریب مکینوں کی مسکراہٹیں کیمرے کی ٹک کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور پھر اس کے ساتھ ہی غائب ہوتی ہیں۔

"سلیم! ہم تمہیں ایک تصویر ضرور بھیجیں گے" جاپانی نے بچے کو مخاطب کر کے سلیس اُردو میں کہا۔ "ایک مہینے کے اندر اندر ضرور بھیج دیں گے"

اور پھر وہ کیمرہ گلے میں لٹکائے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ہم بھی کچھ دُور تک گئے اور پھر واپس آنے کا ارادہ کیا کہ بھوک نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔

اُترائی اُترتے ہوئے سڑک کے برابر میں ایک پتھر پر بیٹھا ہوا ایک سفید ریش بزرگ اچانک اپنی جگہ سے اُٹھ کر ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ چیتھڑوں میں ملبوس تھا۔ اس نے میلا چکیٹ کوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کے سائز سے بڑا تھا۔ اس بزرگ کی عمر کوئی نوّے برس کے قریب تھی۔ اس کے چہرے پر گہری جھریاں تھیں اور آنکھوں کے پپوٹے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ پتھر سے اُٹھ کر

اچانک ہمارے سامنے آیا اور اس نے اشعار پڑھنا شروع کر دیے۔

ان کی گلی میں جاؤں تو چالان کا ہے ڈر

نوٹس لگا ہوا ہے، ادھر راستہ نہیں

دیکھو جفا یہ میرے تغافل شعار کی

کھڑکی کھلی ہوئی ہے، مگر جھانکتا نہیں

مجنوں کے تن بدن پہ کوئی چیتھڑا نہیں

فرا نہیں ہے کوٹ نہیں جانگیہ نہیں

اس نے یہ اشعار اسی ترتیب سے سنائے تھے اور اس کے بعد اس نے ہمیں متعدد اشعار سنائے جن کا مطلع وہ شروع کے بجائے آخر میں پڑھتا تھا۔ ہم نے میلے چکٹ چیتھڑوں میں ملبوس، شکل وصورت سے بالکل گنوار، اس عمر رسیدہ پہاڑیے سے اُردو کے یہ اشعار انتہائی عمدہ ادائیگی کے ساتھ سُنے تو ششدر رہ گئے۔ ایک شعر اس نے یہ بھی سنایا:

روز کہتا ہے کہ دکھلا کوچۂ قاتل مجھے

جُوتیاں کھلوائے گا اُلّو کا پٹھا دل مجھے

اور پھر دو سخنے، جن میں ایک یہ تھا:

وزیر کیوں نہ رکھا، انار کیوں نہ چکھا؟

دانا نہ تھا!

میں نے اپنی بڑھتی ہوئی حیرت پر قابو پایا اور پوچھا "بابا! آپ کا نام کیا ہے؟"

"مولانا فضل الدّین!" بابا کے لہجے میں افتخار کا پہلو تھا۔

"آپ کا کیا شغل ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"مَیں قرآن مجید کی تعلیم دیا کرتا تھا!"

دریں اثناء بھوک مزید چمکنا شروع ہو گئی تھی، سو مَیں نے "معانقہ" کرنے کے بعد چلتے چلتے پوچھا: "بابا، آپ کی شادی ہوئی ہے!"

"نہیں" مولانا فضل الدّین نے جواب دیا: "ہم ملکیت کے قائل نہیں ہیں۔"

"مرحبا" ریستوران میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی جو چھُری کانٹوں سے لیس مختلف میزوں کے گرد جمع تھے۔ ہم نے ریستوران کے آخری سرے پر ایک میز تلاش کی اور ابھی وہاں بیٹھنے ہی کو تھے کہ برابر والی میز سے ایک ننھی منی بچّی نے جو اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی تھی، غیر ملکی لہجے میں ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے ہوئے کہا: "یہ میز ہمارے لیے ریزرو ہے۔" اس بچّی کے خدوخال پاکستانیوں جیسے تھے۔ مَیں نے منصور قیصر سے کہا: "یار! یہ بچّی بالکل پاکستانی لگتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" منصور قیصر نے کہا: "سچ مچ پاکستانی ہے، اس کے ساتھ اس کے والدین ہیں اور یہ میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہیں۔"

ہم یہاں سے ہٹ کر برابر میں خالی ایک اور میز پر بیٹھ گئے۔ دونوں میاں بیوی ہماری خالی کردہ میز پر آ کر بیٹھ گئے تھے اور بچّی سے انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ میری نظر سامنے کی جانب اٹھی، تو وہاں کشمیر پوائنٹ والا زرد رُو جاپانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہُوا تھا اور پوری محویت سے ایک اُردو اخبار پڑھنے میں مشغول تھا۔

میری نشست ریستوران کے مرکزی دروازے کے بالمقابل واقع تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازہ کھُلتا تھا اور خوشبو کے جھونکے رُوح میں سرایت کر جاتے تھے۔

ڈاکٹر صفدر محمود کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ جب انہوں نے دھنک رنگ بکھرتے دیکھے تو کہا: "آؤ سیٹ بدل" بھائی بن جائیں۔"

"آئی ایم سوری"۔ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا: "میں جب کرسی پر ایک دفعہ بیٹھ جاؤں، وہاں سے اٹھا نہیں کرتا۔"

منصور قیصر کی پشت بھی دروازے کی طرف تھی اور اس کی گردن میں بل پڑ گئے تھے۔ وہ اب بھی گردن موڑے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

چھ ہزار فٹ کی بلندی سے واپس نشیب کی طرف جاتے ہوئے میرے کان ایک بار پھر بند ہونا شروع ہو گئے تھے۔ صفدر محمود اور منصور قیصر باتیں کر رہے تھے اور میں پوری طرح ان کی بات سمجھے بغیر یوں ہی سر ہلا دیتا تھا۔ میں غالباً ان لوگوں میں سے ہوں جن کے کان بلندی پر پہنچ کر بھی بند ہو جاتے ہیں اور پستیوں کی طرف جاتے ہوئے بھی ان کی سماعت جواب دے دیتی ہے۔ میں نے اس موقع پر اپنے ایک دوست کی بتائی ہوئی ترکیب آزمانے کے لیے حلق میں تھوک جمع کیا اور پھر اسے نگل لیا۔ جس سے تھوڑی دیر کے لیے مجھے آوازیں سنائی دیں، مگر کچھ ہی دیر بعد کان پھر بند ہو گئے۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ میں یہی عمل دہراتا رہا، لیکن اب اس کا نتیجہ تھوک نگلنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

شہزادے اوئے!

لاہور سے پنڈی جانے والی ریل کار میں وہی میلی سفید وردی میں ملبوس کھچڑی بالوں والا زرد رُو بیرا تھا اور وہی کلف لگے ہوئے مسافر تھے۔ گاڑی سٹیشن سے باہر نکلی تو کچھ ہی دیر بعد کھچڑی بالوں والے بیرے نے آرڈر لینے شروع کر دیے اور پھر اس نے نشستوں کے بازوؤں میں ٹرے کے لیے بنے ہوئے سوراخوں میں ماچس کی تیلی پھنسا کر ٹرے سجانے شروع کر دیے۔ میری پچھلی نشست پر ایک نوجوان جوڑا بیٹھا تھا جو اپنی چار سالہ گڑیا سی بیٹی کے ساتھ مسلسل انگریزی بولنے میں مشغول تھا۔ یہ گڑیا بھی انگریزی بولتی تھی۔ میرے دائیں ہاتھ والی سیٹ پر دو "جوان جہان" لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک کے بال کٹے ہوئے تھے اور دوسری نے اپنے گھنے ریشمی بال شانوں پر پھیلائے ہوئے تھے۔ اس کی لمبی لمبی انگلیوں میں جلتا ہوا سگریٹ تھا جسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ہونٹوں سے لگا لیتی تھی۔ یہ دونوں پاکستانی لڑکیاں بھی انگریزی ہی میں ایک دوسرے سے محو گفتگو تھیں۔ ان سے اگلی نشست پر ایک لڑکا اور ایک لڑکی بیٹھے تھے وہ سب سے بے نیاز پوری محویت کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ لگتا تھا نئی نئی شادی ہوئی ہے یا پھر یہ کہ نہیں ہوئی ہے۔ مجھ سے اگلی نشست پر ایک گھریلو قسم کی عورت نے ساتھ والی نشست پر اپنے

چھ سات ماہ کے بچے کو کمبل میں لپیٹ کر لٹایا ہوا تھا اور خود بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ اس کے آگے اس خاتون کا شوہر دو شریر قسم کے بچّوں کو قابو کیے ہوئے تھا۔ یہ گھٹے ہوئے جسم والا شخص تھا۔ اس نے قیمتی سوٹ پہنا ہُوا تھا مگر چہرہ کھردرا تھا۔ اس کے آگے دروازے تک پھیلی ہوئی نشستوں پر متعدد مسافر بیٹھے تھے جن میں سے بیشتر اپنی فیملی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ شیشے والے دروازے کے آگے دائیں بائیں واقع غسل خانوں کے بعد ایک کیبن تھا جس میں ڈیوٹی پر مامور ریلوے کا ایک ملازم ٹیوب لائٹوں سے منوّر اس کمپارٹمنٹ کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا اس کی نگاہیں مضبوطی سے بند دروازے کا شیشہ چیرتی ہوئی اندر داخل ہوتی تھیں اور پھر اپنی مرضی کے کسی چہرے کے ساتھ چپک جاتی تھیں!

کمپارٹمنٹ میں خاصی خاموشی طاری تھی، یہاں گاڑی کا شور بھی "سنسر" ہو کر پہنچتا تھا۔ لوگ ہونٹوں کو بھینچ کر چائے پینے میں مشغول تھے۔ "سموکر" لڑکی اور اس کی ساتھی نے اپنے لیے کوک منگوایا تھا اور وہ ہولے ہولے "سپ" کر رہی تھیں۔ گھٹے ہوئے جسم اور کھُردرے چہرے والے شخص نے اپنے دونوں بیٹوں کو زبردستی اپنے دونوں طرف بٹھایا ہُوا تھا۔ وہ خود چائے پی رہا تھا اور انہیں اپنے بیگ میں سے کیلے نکال نکال کر کھلا رہا تھا۔ ان میں سے بڑے بچّے کی عمر کوئی چار پانچ سال تھی اور وہ "دندبوڑا" تھا۔ اس کے چہرے پر وہ حسُن تھا جو قدرت نے تمام بچّوں کو یکساں طور پر عطا کیا ہے چھوٹا بچہ کوئی تین سال کا تھا اور وہ بھی بہت پیارا تھا۔ دروازے کے پاس والی نشست سے پھُندنے والی ٹوپی پہنے ایک بچہ غالباً اپنے چاروں طرف گھور

ہو کر بیٹھے ہوئے لوگوں سے اکتا کر اٹھا اور ان دو بچوں کے برابر میں آن کھڑا ہو گیا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ "خیر سگالی" کے جذبات کے اظہار کے ساتھ غالباً انہیں کھیلنے کی دعوت بھی دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر دونوں بچے اپنی جگہ سے اٹھے مگر ان کے باپ نے انہیں مضبوطی سے بازو سے پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ یاسر نے اپنے ننھے منے بازو میرے گلے میں ڈال دیے اور کہا: "ابو! میں کھیلوں"! میں نے اس کے گالوں پر بوسہ دیا اور اسے بچے کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھوڑ دیا۔ عمر نے خود ہی گلے میں پڑی چوسنی پکڑ کر منہ میں ڈال لی تھی اور اب وہ شہناز کی گود میں سر رکھ کر سو گیا تھا۔

کھچڑی بالوں والے بیرے نے ٹرے اور برتن واپس اپنی جگہ رکھ دیے تھے اور وہ کمپارٹمنٹ سے باہر چلا گیا تھا۔ لوگ اسی طرح "کمپوز" ہو کر بیٹھے تھے۔ یاسر اور پھندنے دار ٹوپی والا بچہ معصوم معصوم سی کھیلوں میں مشغول تھے مگر ارد گرد کے ماحول کے تناؤ کے باعث ان کی شوخیاں کچھ دبی دبی سی تھیں۔ گٹھے ہوئے جسم والے شخص پر کچھ غنودگی سی طاری تھی، چنانچہ اس نے آرام دہ نشست کو پیچھے کی طرف سرکا لیا تھا اور اب وہ آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوا تھا۔ چھوٹا بچہ چپکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دوڑ کر ان بچوں کے پاس پہنچ گیا۔ گٹھے ہوئے جسم والا شخص ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اس نے تصنع سے بوجھل فضا کا سکوت توڑتے ہوئے بھاری بھر کم آواز میں خالص لاہوری انداز میں اپنے بچے کو آواز دی: "شہزادے ادّے!" بچے نے باپ کی طرف دیکھے بغیر اپنی پیش قدمی جاری رکھی، پیشتر اس کے کہ وہ پھندنے دار ٹوپی والے بچے کے پاس پہنچتا گٹھے ہوئے جسم والے شخص نے اسی انداز میں

اس بچے کی ماں کو آواز دی "اپنے بچے کو اپنے پاس بلالیں، شہزادہ "چک" کاٹتا ہے" اور اس کے ساتھ اس نے ایک بار پھر پورے زور سے آواز لگائی "شہزادے اوئے!" مگر شہزادے نے پھندنے دار ٹوپی والے بچے پر اپنے دانت گاڑ دیے تھے۔ بچے نے جواب میں چیخنے کے بجائے اسے پکڑ کر زور سے پرے دھکیل دیا اور پھر وہ دونوں ہنسنے لگے۔ انہیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا اور ہنستے دیکھ کر بہت سے بچوں نے اپنی نشستوں سے ان کی طرف جھانکا اور پھر اپنی ماؤں سے بازو چھڑا کر وہ بھی ان میں شامل ہو گئے کمپارٹمنٹ کی غیر فطری فضا کو فطرت کے ان معصوم نمائندوں نے زندگی کی رونق سے مالا مال کر دیا تھا۔ شہزادہ، بچوں کو باری باری "چک" کاٹنے کی کوشش کرتا تھا۔ جواب میں وہ ہنستے ہنستے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے تھے۔ گٹھے ہوئے جسم والے شخص نے یہ دیکھ کر آخری دفعہ زور سے آواز لگائی "شہزادے اوئے!" اور پھر اس نے آنکھیں بند کر کے نشست کے ساتھ ٹیک لگالی۔

آدھی رات کا سفر

تیز گام کراچی سے دو ڈھائی سو میل دور نکل آئی تھی اور پوری رفتار سے لاہور کی جانب رواں تھی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ گزشتہ پانچ گھنٹے کے دوران میں اور امجد دنیا جہان کے موضوعات پر گپ شپ لگانے کے بعد نڈھال ہو چکے تھے۔ تازہ لطیفوں کا سٹاک بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور رسائل و جرائد کی ورق گردانی کا "دور" بھی ہم نے مکمل کر لیا تھا۔ بحری قزاقوں جیسے حلیے والا ویٹر کھانے اور چائے کے برتن سمیٹ کر کب کا جا چکا تھا۔ ہم نے جب اسے بل ادا کرنا چاہا تو اس نے کہا کہ وہ اکٹھا ہی وصول کرے گا۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتا تھا انہوں نے ابھی صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا بھی اسی ٹرین میں کھانا ہے۔ اب میری آنکھوں میں نیند اُتر رہی تھی، امجد بھی سونا چاہتا تھا، کیونکہ اس دوران وہ اپنی "زلفوں" کی طرف سے بے پرواہ ہو چکا تھا۔ شام کو ٹرین پر سوار ہوتے ہوئے اس نے اپنے سر کے عقبی حصے پہ موجود چند بالوں کو کھبر گھار کر پورے سر پر مساوی طور پر تقسیم کیا تھا، مگر اب یہ بال اپنے "بال بچوں سمیت" واپس اپنی جگہ پر چلے گئے تھے۔ امجد نے عینک بھی اتار دی تھی اور اب وہ نیند کے غلبے کے باعث اپنی چندھیائی چندھیائی آنکھوں کو مل رہا تھا۔

"اچھا عزیزی خدا حافظ" اس نے ایک ضخیم رسالے کو سرہانے کے طور پہ

استعمال کرتے ہوئے کروٹ لی کہ علم ہی اس نوجوان کا اوڑھنا اور بچھونا ہے! اور پھر نچلی نشست کی بتی گل کر دی۔

خدا حافظ!" مَیں نے ایک نظر اپنے "کوپے" کے دروازے پر لگی چٹخنی چیک کرنے کے لیے وہاں ڈالی اور پھر اپنی اوپر والی نشست کی بتی گل کرنے کے لیے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر بٹن میں کوئی نقص تھا جس کی وجہ سے بتی بند ہونے سے انکاری تھی، چنانچہ مَیں نے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی اور ٹانگیں بتی والی سائیڈ کی طرف دراز کر کے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں محوِ خواب تھا!

اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہمارے "کوپے" کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ مجھے کسی انجانے سے خطرے کا احساس ہوا اور مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ مَیں نے گھڑی دیکھی، تو گیارہ بجے تھے۔ تیز گام رات کے سناٹوں کو چیرتی ہوئی کسی غیر آباد علاقے سے گزر رہی تھی۔ دروازے پر دستک ایک بار پھر سنائی دی، مگر اس دفعہ دستک برابر والے "کوپے" پر دی گئی تھی۔ مَیں نے امجد کو آواز دی، مگر وہ گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ مَیں اپنی برتھ سے اتر کر نیچے آیا اور امجد کو بازو سے ہلا کر جگاتے ہوئے کہا: "آنکھیں کھولو! باہر راہداری میں کوئی ہے۔" امجد نے آنکھیں کھولے بغیر دوسری طرف کروٹ لی اور کہا: "سو جا کشمیری پُتر، سو جا، کوئی نہیں ہے!" پیشتر اس کے کہ مَیں کچھ کہتا ایک بار پھر کسی نے زور زور سے ہمارے "کوپے" کا دروازہ کھٹکھٹایا جس پر امجد ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور اس نے گھبرائی گھبرائی آواز میں پوچھا "کون ہے، کون ہے؟" مگر آگے سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"مَیں پوچھتا ہوں کون ہے؟" اس بار امجد نے اپنی آواز میں گھن گرج پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے زور سے کہا، مگر دوسری طرف سے کوئی جواب

نہ آیا!

مجھے اپنے جسم میں سوئیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے امجد سے کہا "زنجیر کھینچ دو"۔ میں نے یہ بات اتنی بلند آواز میں کہی کہ باہر کھڑے شخص کے کانوں تک بھی پہنچ سکے۔

"نہیں! کوئی ضروری نہیں! جو کوئی بھی ہے خود ہی چلا جائے گا" امجد نے کہا۔

اس کے بعد جب کافی دیر تک کوئی کھڑاک سنائی نہ دیا تو میں اور امجد دوبارہ اپنی اپنی برتھوں پر لیٹ گئے، مگر اب نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"یار یہ کون بے ہودہ آدمی ہے؟" امجد نے مجھ سے کہا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا، "چلو دفع کرو، سو جاؤ!" اور ایک بار پھر وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ میں نے بھی بتی کی طرف ٹانگیں پھیلائیں اور چت لیٹے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

ہم دونوں نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں، مگر جاگ رہے تھے۔ اچانک امجد بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پھرتی سے اپنے سرہانے کی بتی جلائی اور کہا: "عطا! اب وہ کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ تم یہ ہاتھ دیکھ رہے ہو؟" میں نے جلدی سے اپنی برتھ سے چھلانگ لگائی اور نیچے کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے شیشے کے ساتھ ناک چپکا کر دیکھا تو ایک مضبوط ہاتھ چلتی ٹرین سے باہر لہرا رہا تھا۔ باہر جو کوئی تھا اس کی شکل نظر نہیں آرہی تھی؛ البتہ وہ ہاتھ کی انگلیوں سے ڈبے کی چٹخنی کھولنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بار پھر یہ ہاتھ شیشے کی طرف بڑھا اور اس نے زور زور سے شیشہ تھپتھپانا شروع کر دیا۔

"یار یہ کون ہے؟" امجد نے جھنجھلا کر ایک بار پھر کہا۔

"مجھے تو یہ وہی بیرا لگتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کی گول آستین دیکھو، سفید یونیفارم کا حصہ ہے۔"

میں نے اور امجد نے اپنے ناک شیشے کے ساتھ چپکائے ہوئے تھے۔ اور ایک اپنچ کے فاصلے پر کھلی آستین والا ہاتھ اندھیروں میں لہراتا دیکھ رہے تھے۔ میرے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر آئیں۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور انہیں اس میں جذب کر لیا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا کہ یہ شخص جو باہر دروازے سے لٹکا ہوا ہے اس کا ہاتھ کھڑکی تک کیسے پہنچ گیا، کیونکہ یہ تو خاصے فاصلے پر واقع ہے!" میں نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں، پہنچ سکتا ہے۔ ویسے بھی چوروں کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں!" امجد نے سخت کھنچاؤ کی کیفیت کو کم کرنے کے لیے شگفتہ انداز میں جواب دیا۔ مگر میری طرح وہ بھی یقیناً اس صورت حال سے سخت پریشان تھا۔

وہ ہاتھ ایک بار پھر شیشہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

"دفعہ ہو جاؤ سؤر کے بچے۔" امجد نے جھنجھلاہٹ کے عالم میں چیخ کر کہا، مگر اس کی آواز چلتی ٹرین کے شور اور دبیز شیشے کی وجہ سے اس چھوٹے سے کمرے میں گھٹ کر رہ گئی۔

"اس کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ زنجیر کھینچ دی جائے۔" میں نے امجد سے کہا اور پھر خود ہی برابر میں لگی زنجیر کو زور سے اپنی طرف کھینچ دیا۔ ٹرین میں بریکیں لگنا شروع ہو گئیں۔ پھر ٹرین کی رفتار کم ہوئی اور تھوڑی دیر بعد ٹرین ایک جنگل میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا وہ سفید آستین والا ہاتھ غائب ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد اس ایئر کنڈیشنڈ بوگی کے بیرونی دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ بعدازاں کچھ لوگ اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے راہداری میں داخل ہوئے۔ ہمارے "کمرے" کے باہر پہنچ کر کچھ دیر کے لیے رُکے اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ واپس جا رہے ہیں۔ چند ثانیوں بعد بوگی کے دروازے کھڑاک سے بند ہو گئے اور گاڑی ایک بار پھر فراٹے بھرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئی۔

"یہ کیا بات ہے؟" امجد نے حیرت سے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "یہ لوگ ہمارے دروازے کے قریب پہنچ کر فوراً لوٹ گئے۔ انہوں نے ہم سے زنجیر کھینچنے کی وجہ ہی نہیں پوچھی؟"

"یار مجھے تو یہ سارا معمہ ہی سمجھ نہیں آ رہا۔" میں نے روہانسا ہو کر کہا۔

"چلو چھوڑو لعنت بھیجو۔" امجد نے جواب دیا۔

"اب ذرا ریلیکس ہو جاؤ، وہ اگر کوئی ڈاکو بھی تھا تو یقیناً یہاں اتر گیا ہو گا۔"

"وہ یہاں اترا نہیں بلکہ پھر سے ٹرین میں سوار ہو گیا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ وہ اسی ٹرین کا بیرا تھا۔ تم نے اس کی سفید گول آستین نہیں دیکھی؟"

"ہاں یار یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔" امجد نے یہ فقرہ یوں ادا کیا کہ لگتا تھا۔ وہ صورتِ حال کے کھچاؤ سے نکل آیا ہے۔ "تبھی وہ شام کو کہہ رہا تھا کہ وہ بل اکٹھا ہی وصول کر لے گا۔"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"باقی باتیں چھوڑو۔" میں نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔ "آج اِسی بہانے میری

زندگی کی ایک بہت بڑی خواہش پوری ہو گئی ہے!"

"وہ کیا؟"

"چلتی گاڑی میں زنجیر کھینچنے کی خواہش، بچپن میں کئی دفعہ اپنی یہ خواہش پوری کرنے کی کوشش کی مگر اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر بٹھا دیا۔"

"کہیں یہ سارا ڈرامہ تم ہی نے زنجیر کھینچنے کے لیے تو نہیں رچایا تھا؟" امجد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تو نہیں ابھی تھوڑی دیر کو پتہ چل جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تو میں نے "کوپے" کا دروازہ کھولا اور باہر راہداری میں آ گیا۔ راہداری میں کنٹین کا عملہ سویا ہوا تھا۔ میں ان سے بچ کر گزرتا ہوا بوگی کے مینجر کے پاس گیا اور اس سے سارے واقعے کی تفصیل بیان کی اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ دراصل ایک دوسری بوگی کے بیرے کو کسی مسافر کے لیے دودھ کی تلاش تھی، لہٰذا وہ ایک بوگی میں سے دوسری بوگی کو ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا۔ چنانچہ وہ آپ سے دودھ کا پتہ کرنے کے لیے دروازہ اور پھر باہر کی جانب سے کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹاتا رہا ہے لیکن مینجر کی اس وضاحت سے میری تسلی نہ ہوئی، چنانچہ میں نے اسے ساتھ لیا اور اس کی مدد سے اس بیرے کو تلاش کیا۔ میری نظر سفید یونیفارم میں ملبوس اس بیرے کے گول آستین والے ہاتھ پر ٹھہر گئی۔ مگر یہ بحری قزاق ایسے حلیے والا بیرا نہیں تھا جس نے ہمیں رات کا کھانا اور چائے "سرو" کی تھی، بلکہ کوئی اور تھا۔ میں نے اس سے ذرا پوچھ گچھ کی، تو وہ گھبرا گیا اور گڑگڑایا۔ "جناب مجھے معاف کر دیں۔"

"تو کیا تم نے اسے معاف کر دیا؟" اپنے "کوپے" میں واپسی پر امجد نے یہ روداد

مجھ سے سن تو پوچھا۔

"ہاں"

"وہ کیوں؟" امجد نے کہا۔

"وہ اس لیے کہ ابھی آدھی رات باقی ہے۔ آدھا سفر باقی ہے اور میں دریا میں رہتے ہوئے اس مگر مچھ سے بیر نہیں رکھنا چاہتا۔ باہر گھپ اندھیرا ہے۔ اندر سب سوئے ہوئے ہیں۔ میں تو اپنے اس ایئر کنڈیشنڈ آرام دہ سفر کو بدمزہ نہیں کروں گا۔ میری مانو تو تم بھی اچھے بچوں کی طرح سب کچھ ذہن سے جھٹک کر صرف اپنا سفر خوشگوار بناؤ، لٹیروں کے منہ نہ لگو۔ شاباش!" اور پھر میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر دیں!

محمد حسین کی دُوسری ہجرت

جہاز نے کراچی کے لیے ٹیک آف کیا، تو میرے برابر میں بیٹھے ہوئے دیہاتی نوجوان کی آنکھیں تارے لگ گئیں. جہاز جوں جوں اوپر کی طرف جا رہا تھا اس کی آنکھیں باہر کو ابلتی جا رہی تھیں۔ وہ تازہ سلے ہوئے کپڑوں میں ملبوس تھا جن کی دھلائی کی نوبت بھی نہیں آئی تھی، چنانچہ اس کی قمیص اور شلوار پر دھاگوں کے ٹوٹے ابھی تک چمٹے ہوئے تھے۔ وہ تلاشِ روزگار میں بیرونِ ملک جا رہا تھا اور وضع قطع سے سو فیصد "دوبئی چلو" ڈرامے کا کردار لگتا تھا اس کے پاؤں میں دیسی گھی کا ڈبہ پڑا تھا اور جب جہاز نے بندے دے پُتروں کی طرح پرواز شروع کی، تو اس کے ہوش کچھ کچھ ٹھکانے آئے اور اس نے ایک پوٹلی میں سے پنجیری نکال کر مجھے پیش کی۔ اس کا نام محمد حسین تھا۔ اس کے برابر میں بھی ایک سفید پوش بوڑھا دیہاتی بیٹھا تھا جسے غالباً بیرونِ ملک موجود اس کے کسی بیٹے نے ملنے کے لیے بلایا ہو گا۔ محمد حسین کی آنکھوں کی پتلیاں تو واپس اپنی جگہ پر آ گئی تھیں، مگر وہ خاصا بے چین اور مضطرب نظر آتا تھا اور اپنا ایک ہاتھ بار بار اپنی جھولی کی طرف لے کر جاتا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کروٹ بھی بدلتا اور اپنی ان حرکاتِ سکنات کے دوران کنکھیوں سے مجھے یوں دیکھتا جیسے مجھ سے کچھ چھپانے یا کچھ بتانے کی کشمکش میں ہو مگر تاحال کسی فیصلے پر نہ پہنچ پایا ہو کہ آیا اپنی پریشانی کا اظہار کرنا چاہیے

یا نہیں کرنا چاہیے۔ دریں اثنا اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ اپنی جھولی میں ڈالا اور بالآخر وہ ایک فیصلے تک پہنچ گیا۔

"صاحب جی!" اس نے جھینپتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "یہ پٹہ تو کھول دیں مجھ سے کھل نہیں رہا۔"

مَیں نے اس کی جھولی کی طرف دیکھا تو سیفٹی بیلٹ اپنی پوری سختی کے ساتھ اس کی کمر میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس نے میری پیروی میں یہ "پٹہ" باندھ تو لیا تھا مگر اب کھولنے میں اسے اس طرح دشواری پیش آ رہی تھی جس طرح اکثر شریف آدمیوں کو اس ضمن میں پہلی بار پیش آتی ہے۔ مَیں نے جب ہاتھ کی ایک ذرا سی جنبش سے اس کی یہ مشکل رفع کر دی، تو وہ خاصا حیران ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے ایک عظیم "سائنسدان" سمجھا ہو گا!

فضائی میزبانوں نے اپنے مہمانوں کے لیے کھانا چننا شروع کر دیا تھا، مَیں نے اپنے اس رفیق سفر کو "ایمبیرسمنٹ" سے بچانے کے لیے اگلی نشست سے لگی ٹرے کا بٹن کھولا، تو یہ ٹرے ایک چھوٹی سی میز کی صورت میں اس کے سامنے بچھ گئی۔ وہ میری اس "سائنسدانی" پر یقیناً ایک بار پھر حیران ہوا ہو گا۔ کھانے میں جو کچھ تھا وُہ محمد حسین خاصی بے دلی سے چبا رہا تھا۔ اس دوران اس نے اپنے پاؤں میں دھرے ٹفن کیریئر کی طرف دو ایک دفعہ ہاتھ بھی بڑھایا جس میں یقیناً گندلوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی ہو گی، مگر وہ ہر دفعہ رک گیا۔ شاید وہ ایک اور "ندامت" کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے باریش دیہاتی بزرگ بھی کچھ اسی کی طرح یہ کھانا زہر مار کر رہے تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد بھی جب کچھ دیر تک فضائی میزبانوں نے ادھر کا رُخ نہ کیا تو اس بزرگ نے کچھ فاصلے پر سے

گزرتی ہوئی ایک ایئر ہوسٹس کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور پھر بآوازِ بلند کہا "کڑیے!
اسے بھانڈے نے چُک کے لے جا!" (لڑکی! یہ برتن تو اٹھا کر لے جاؤ!)

اس دوران میں نے اکتاہٹ کے عالم میں ایک جمائی لی اور کافی کا انتظار
کرنے لگا، میں اگرچہ محمد حسین سے پہلی بار متعارف ہوا تھا مگر میرے لیے یہ شخص نیا
نہیں تھا، میں نے کئی برس قبل میونخ کی "بابے دی ہائم" میں محمد حسین جیسے اپنے
بے شمار ہم وطنوں سے ملاقات کی تھی۔ جرمنی میں "ہائم" ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں
بے شمار لوگ ایک چھت تلے رہتے ہوں اپنے اپنے گھروں سے روزگار کی تلاش
میں نکلے ہوئے ہزاروں پاکستانی میونخ کی اس نوع کی ہائموں میں اپنے اپنے گھروں سے
بھی بدتر حالات میں وہاں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی سہولت کے لیے ان ہائمز کے
نام تجویز کر رکھے تھے۔ کسی کو وہ "چاچے کی ہائم" اور کسی کو "ماسے دی ہام" کہتے تھے جو ہائم میں
نے دیکھی تھی اس کا نام "بابے دی ہائم" تھا وہ شہر میں دن بھر محنت مزدوری کرتے اور
رات کو "بابے دی ہائم" میں قطار اندر قطار بچھی چارپائیوں پر باری باری آکر سو جاتے
اور سُکھ کے سپنے دیکھتے۔ میں نے ان سب کی کہانیاں سُنی تھیں۔ ان کے سروں پر کتنی
ذمہ داریاں تھیں اور وہ کن حالات میں ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ
میں نے ان کی زبان سے سنا تھا۔ یہ بہت دل خراش کہانیاں تھیں اور ایک دل خراش
کہانی محمد حسین کی صورت میں اس وقت بھی میرے ہم رکاب تھی، چنانچہ اس سے گفتگو
کے نتیجے میں مجھے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی۔ اگر معلوم ہُوا تو یہی کہ اس کا باپ مرچکا
ہے۔ سات بن بیاہی جوان بہنوں کا وہ اکلوتا بھائی ہے جن کی عمریں ڈھلنا شروع
ہو گئی ہیں، ماں محنت مزدوری کرتی ہے اور اب اس نے پیسہ پیسہ جوڑ کر ادھر
اُدھر سے جمع کر کے اپنے بیٹے کو باہر بھجوانے کا انتظام کیا ہے۔ وہ اپنے جگر سے

اپنے ٹکڑے کو علیحدہ کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

کراچی اب دور نہیں تھا، چنانچہ جہاز اب آہستہ آہستہ بلندی سے پستی کی طرف آ رہا تھا۔ محمد حسین نے ایک ہجرت، ۱۹۴۷ء میں کی تھی اور اس کی دوسری ہجرت کا سلسلہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک جاری ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس کی ہجرت اپنی روحانی ضرورتوں کے لیے تھی جب کہ اس کی دوسری ہجرت کا سلسلہ اس کی معاشی ضرورتوں کے تحت ہے، اس کے نبیؐ نے مکے سے مدینے کی طرف صرف ایک ہجرت کی تھی اور دین اور دنیا کے مقاصد کی تکمیل ہو گئی تھی۔ جوں جوں جہاز پستی کی طرف جاتا محمد حسین کا دل ڈوبنے لگتا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ ہولے ہولے وِرد کر رہا تھا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبحانَکَ اِنّی کُنْتُ مِنَ الظّالِمین۔

شیرا اور مکھیاں

آج ہم نے پندرہ بیس مکھیوں کو اچھرے سے لبرٹی مارکیٹ تک اپنے موٹر سائیکل پر "لفٹ" دی ہے۔ گزشتہ روز پٹرول کی ٹینکی پر آئس کریم کا "شیرا" گر گیا تھا جو سوکھ جانے پر ٹینکی کے ساتھ چمٹ کر رہ گیا! چنانچہ آج جب ہم نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی، تو ٹینکی پر پندرہ بیس مکھیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم نے ایک دفعہ انہیں ہاتھ سے اُڑانے کی کوشش کی، مگر وہ صرف ایک لمحے کے لیے فضا میں بلند ہوئیں اور اس کے بعد دوبارہ ٹینکی پر بیٹھ گئیں۔ ہم نے جانا کہ یہ سیر و تفریح کے موڈ میں ہیں اور ایک چکر لبرٹی مارکیٹ کا لگانا چاہتی ہیں سو چُپ رہے اور موٹر سائیکل کا رخ فیروز پور روڈ کی طرف موڑ دیا!

فیروز پور روڈ سے نہر کی طرف جاتے ہوئے ہم نے ایک نظر ٹینکی پر ڈالی۔ مکھیاں ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑے فرحاں و شاداں بیٹھی غالباً گپ شپ میں مشغول تھیں۔ ہمارا خیال تھا کہ چلتے موٹر سائیکل پہ ہوا کے تھپیڑوں کی وجہ سے یہ اڑ جائیں گی، مگر انہوں نے اپنے پاؤں مضبوطی سے ٹینکی پر جمائے ہوئے تھے اور ان پر ہوا کے تھپیڑوں کا کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا، بلکہ ہمیں تو کچھ یوں محسوس ہُوا جیسے خوشگوار ہوا نے ان کے موڈ خوشگوار کر دیے ہیں، اور اب وہ یہاں سے "نقل مکانی" کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں۔ نہر کے قریب ٹریفک سگنل کے سرخ ہونے کی وجہ

سے ہم رُکے تو مکھیاں اسی طرح ٹینکی کے ساتھ چمٹی ہوئی تھیں۔ ہمیں کچھ گھِن سی محسوس ہوئی اور ہم نے انہیں ہاتھ سے اڑانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں صرف چار پانچ مکھیاں اڑیں، مگر دریں اثنا ان کی جگہ چار پانچ مکھیاں اور آ کر بیٹھ گئیں۔ اتنے میں سگنل بند ہو گیا تھا۔ ہم نے ایکسیلیٹر دیا اور چکیاں موڑ کی طرف گامزن ہو گئے!

چکیاں سے لبرٹی مارکیٹ والی سڑک کی طرف مڑتے ہوئے ہم نے موٹر سائیکل آہستہ کیا اور ایک دفعہ پھر مکھیاں اڑانے کی کوشش کی، کیونکہ جس "خدا ترسی" کے جذبے کے تحت ہم نے انہیں لفٹ دی تھی، وہ مدھم پڑ گیا تھا اور اس کی جگہ اب گھِن نے لے لی تھی۔ لیکن اس بار بھی یہی ہوا کہ چار پانچ مکھیاں اڑ گئیں اور ان کی جگہ چار پانچ دوسری مکھیوں نے لے لی۔ وجہ ظاہر ہے کہ ٹینکی کے ساتھ شیرا بدستور لگا ہوا تھا؛ لہٰذا ہم نے صبر شکر کیا اور بڑے "راؤنڈ اباؤٹ" سے موٹر سائیکل کا رُخ لبرٹی مارکیٹ کی طرف موڑ دیا۔

یہاں ہماری طرح اور بھی بہت سے لوگ اپنی کاروں اور موٹر سائیکلوں سمیت ایک سنیک بار کے گرد جمع تھے اور خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ہماری طرح ان میں سے بھی بیشتر کے ساتھ مکھیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ کچھ وقت ہم نے یہاں گزارا اور پھر اپنی مکھیوں کو لے کر واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ رستے میں جب بھی ہم نے انہیں اڑانے کی کوشش کی، ہر بار یہی ہوا کہ کچھ مکھیاں اُڑ گئیں، مگر ان کی جگہ فوراً دوسری مکھیوں نے لے لی۔ سو گھر پہنچتے ہی ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پانی کی بالٹی لے کر موٹر سائیکل دھونے بیٹھ گئے اور ٹینکی پر لگے شیرے کو اچھی طرح صاف کر دیا تاکہ کہیں شیرا لگا ہوا ہو اور نہ اس پر مکھیاں بیٹھیں۔

اور اس وقت سے ہم یاروں دوستوں کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے کوئی دکھڑا بھی روئیں، ہم اس کے جواب میں انہیں ایک ہی نسخہ بتاتے ہیں کہ ٹشیرا صاف کر دو۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ دفتروں میں کام نہیں ہوتا۔ شکایت کرو تو اہل کار کھانے کو دوڑتے ہیں۔ ہم بتاتے ہیں کہ ٹشیرا صاف کر دو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ جان و مال محفوظ نہیں۔ جرائم پیشہ عناصر دیدہ دلیر ہو گئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں یہ ٹشیرے کی وجہ سے ہے، اسے صاف کر دو۔ دوست کہتے ہیں کہ کرپشن نے ناطقہ بند کیا ہوا ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ فساد بھی ٹشیرے ہی کی وجہ سے ہے۔ اس کی موجودگی میں تم پرانی مکھیاں اڑاتے رہو گے اور نئی مکھیاں ان کی جگہ لیتی رہیں گی۔ بس یہ ٹشیرا دھو ڈالو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

بجلی بند

رات کے گیارہ بجے تھے۔ فلیمنگ روڈ پر گھپ اندھیرا تھا۔ مَیں نے اپنے ایک دوست کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو مکان کی چھت پر سے ایک بچّے نے جھانکا۔ اس نے قمیص اتاری ہوئی تھی۔ "ماموں گھر پر نہیں ہیں۔ وہ کہہ گئے تھے جب بجلی آئے گی مَیں آؤں گا۔" یہ سُن کر مَیں نے موٹر سائیکل سامنے واقع پان سگریٹ کی دکان پر کھڑا کیا اور سیٹ پر بیٹھ کر سگریٹ سُلگانے لگا۔

عام حالات میں ٹیوب لائٹوں سے جگمگ جگمگ کرتی یہ دکان اس وقت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی، یہاں صرف ایک موم بتی روشن تھی جس کی روشنی میں دکاندار کھرے اور کھوٹے سکّے میں پہچان کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ دکان کے چاروں کونوں میں لگے آئینوں میں اس کا عکس ایک ڈراؤنی تصویر کی طرح تھا۔ گاہک تو اس وقت ایک آدھ ہی تھا، البتہ بجلی بند ہونے کی وجہ سے شدید گرمی نے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا اور اس وقت وہ دکان کے قریب کھڑے "جلاوطنی" کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان میں ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا جس نے لیٹسٹ ڈیزائن کی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور کڑھائی والا کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کے برابر میں ایک سفید ریش بزرگ تھے جنہوں نے قمیص اتار کر کاندھوں پر رکھی تھی۔ ہاتھ میں کھجور کا پنکھا تھا جسے وہ اس انداز سے جھل رہے

تھے کہ ہوا دوسروں تک بھی پہنچے۔ ایک ملنگ بھی یہاں موجود تھا جس نے "میکسی" پہنی ہوئی تھی۔ ایک چالیس پینتالیس سالہ پہلوان نما شخص دھوتی کو "منی" بنائے یہاں کھڑا تھا۔ سفید ریش بزرگ سمیت سبھی واپڈا والوں کے عزیز و اقارب کے بارے میں شدید قسم کی گستاخیاں کر رہے تھے۔ ایک میکسی والا ملنگ تھا جو منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ بس واپڈا کا ذکر آنے پر میکسی کے آخری سرے پر پنکھا جھلنے لگتا تھا۔ میں ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اور اپنے "ہمسایوں" کی زبان سے دو چار مخصوص گالیوں کو "ریپیٹ" ہوتے دیکھ کر بور ہو گیا اور موٹر سائیکل سے اتر کر سڑک پر چہل قدمی کرنے لگا۔ اندھیروں سے آلودہ سڑک پر گھروں سے بے گھر ہوئے لوگ سخت اضطراب کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ ایک کتّا آسمان کی طرف منہ کرکے فریاد کر رہا تھا اور انسان بے زبانوں کی طرح اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ذرا آگے سڑک کے کنارے قطار اندر قطار چار پائیاں بچھی تھیں جن پر ان گھروں کے مکین سو رہے تھے جن کے پاس کمرہ ایک ہے اور "مرداں بسیار" ہیں۔ عورتیں اس ایک کمرے میں جل بھن رہی تھیں اور مرد باہر گرمی کی شدت سے قمیصیں اتارے ننگی چار پائی پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ ان میں سے بعض ایک اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور سرہانے پڑے پنکھے سے ہوا کے مصنوعی جھونکوں کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ برابر کے گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ان کی ماں کی بد دعاؤں کی آواز بھی شامل تھی جو بچوں کو چپ کرانے کی کوششوں میں ناکامی کے بعد اس کے ہونٹوں سے نکل رہی تھی، دل سے نہیں۔

میں ایک بار پھر واپس موٹر سائیکل کی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔ دکاندار شدید

جھنجھلاہٹ کے عالم میں دکان بند کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ کچھ بڑبڑاتا جاتا تھا' یہ بڑبڑاہٹ میں نے سُن لی تھی اور یہ واضح طور پر واپڈا والوں کے حسب نسب کے بارے میں تھی۔ سفید ریش بزرگ، لیٹسٹ ڈیزائن کی ڈاڑھی والا نوجوان اور منی دھوتی والا پہلوان یہاں سے رخصت ہو چکے تھے۔ بس وہی ملنگ کھڑا تھا جو پورے خشوع و خضوع کے ساتھ میکسی سے پنکھا جھلنے میں مشغول تھا۔ اتنے میں سڑک پر روشنی کی ایک لہر اُبھری اور اس کے ساتھ ہی سکوٹر کی آواز سنائی دی۔ یہ روشنی کسی سکوٹر کی تھی اور یہ سکوٹر میرے اسی دوست کا تھا جس کے انتظار میں مَیں بیٹھا تھا۔ اس نے سکوٹر میرے قریب کھڑا کیا اور واپڈا کے بارے میں کچھ اسی قسم کی گفتگو کرنے لگا جسے سُن سُن کر میرے کان پک گئے تھے۔

"مَیں مقررہ پروگرام سے کچھ جلد ہی واپس آ گیا ہوں" دوست نے کہا۔ "کیونکہ مَیں جس دوست کے پاس گیا تھا اس کے ہاں بھی بتی گئی ہوئی تھی اور وہ دوست بھی گھر پر نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر کے دو چار پھیرے لگانے کے بعد مَیں نے سوچا گھر چلا جائے۔"

"یہ تو اچھا ہُوا" مَیں نے کہا "ورنہ تم سے ملاقات نہ ہوتی، کیونکہ مَیں بھی اب جانے ہی کو تھا۔"

"لیکن تم آئے کیسے تھے؟" دوست نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک تو تم سے ملاقات کو جی چاہتا تھا" مَیں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے کہا "اور دوسرے گزشتہ کئی گھنٹوں سے میرے علاقے کی بجلی بھی بند ہے۔"

جھوٹا سفر

مَیں نے ڈیڑھ دو برس سے بیرونِ ملک اور مہینہ پندرہ دنوں سے اندرونِ ملک کوئی سفر نہیں کیا، چنانچہ اس دوران سفر کی کوئی روداد بھی نہیں لکھی۔ سو آپ ایک منٹ کے لیے یہ فرض کریں کہ مَیں ابھی ابھی لاہور سے وزیر آباد روانہ ہونے لگا ہوں، روانہ کیا ہونے لگا ہوں، بس یوں سمجھیں کہ روانہ ہو چکا ہوں؛ چنانچہ میرے گلے میں بیگ ہے اور میں اس وقت لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں۔

مَیں لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں اور میرے چاروں طرف انسانوں کا سمندر ہے۔ یہ سب لوگ کراچی سے آنے والی گاڑی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ یہ گاڑی وزیر آباد، جہلم اور راولپنڈی وغیرہ سے ہوتی ہوئی پشاور جائے گی۔ اس گاڑی میں کچھ مسافر گوجرانوالہ کے بھی ہوں گے جو راستے میں کہیں سے سوار ہوئے ہوں گے۔ اسٹیشن پر جو لوگ موجود ہیں ان میں سے بیشتر تو مسافر ہیں، باقی یا تو اپنے عزیزوں کو الوداع کہنے کے لیے آئے ہیں یا اپنے کسی مہمان کو ریسیو کرنے کے لیے یہاں موجود ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ پلیٹ فارم پر کتابوں، گھریلو مصنوعات اور چائے وغیرہ کے اسٹال ہیں۔ نیز یہاں پھل اور روٹی کباب بیچنے والوں کی ریڑھیاں ہیں۔ سرخ قمیصوں میں ملبوس قلی بھی اپنے کاندھوں

یا ہتھیلوں پر سامان لاد کر پلیٹ فارم کے خالی کونے پُر کرنے میں مشغول ہیں گاڑی لیٹ ہے۔ نہ ابھی سگنل ڈاؤن ہوا ہے اور نہ اناؤنسمنٹ کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ گاڑی کتنی لیٹ ہے۔

مسافروں، ان کو الوداع کہنے والوں اور اپنے عزیزوں کے استقبال کے لیے پلیٹ فارم پر موجود لوگوں کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہیں اور پھر اپنا شک دور کرنے کے لیے پلیٹ فارم کے درمیان میں نصب سرکاری گھڑی پر نظر ڈالتے ہیں۔ کچھ کی گھڑیاں اس گھڑی کے عین مطابق ہیں اور کچھ کی آگے پیچھے ہیں لیکن بے چینی سب کی یکساں ہے جنھوں نے اپنے عزیزوں کا استقبال کرنا ہے وہ چاہتے ہیں کہ جلدی اس کام سے فارغ ہوں، تاکہ جو کام وہ چھوڑ کر آئے ہیں، واپس جا کر جلدی اسے نمٹائیں، اسی طرح اپنے مہمانوں کو الوداع کہنے کے لیے یہاں آئے ہوئے لوگ بھی اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے بے چین ہیں اور جو مسافر اسٹیشن پر موجود ہیں، وہ بھی جلد سے جلد منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتے ہیں، تاہم ان لوگوں کی بے چینی سب سے زیادہ ہے جو کراچی سے آنے والی اس گاڑی میں کل صبح سے سوار ہیں۔ انھوں نے سارا دن سفر کیا ہے، ساری رات سفر کیا ہے اور اب وہ رت جگے سے بے حال اور تھکن سے نڈھال اس منزل تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہیں، جس کے لیے انھوں نے اس قدر صعوبتیں اٹھائی ہیں۔

بے چین صرف یہ اصلی مسافر یا نقلی مسافر ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کے درمیان موجود خوانچہ فروش، قلی اور سٹالوں والے بھی ہیں، ان سب کو گاڑی

کا انتظار ہے۔ گاڑی آئے گی تو یہ رزقِ حلال کمائیں گے، مگر گاڑی نہیں آ رہی' اناؤنسمنٹ ہو رہی ہے، مگر یہ اناؤنسمنٹ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ پلیٹ فارم پر انسانوں کا ہجوم ہے اور وہ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر اس سمت دیکھ رہے ہیں' جدھر سے گاڑی آنی ہے۔ کچھ دیر پہلے لوگوں میں ہلچل سی ہوئی تھی اور وہ اپنا اپنا سامان اٹھا کر ذرا آگے کو سرک آئے تھے، کیونکہ انہیں انجن کی وسل سنائی دی تھی، مگر اب ان کے چہرے پھر لٹک گئے ہیں، کیونکہ وہ گاڑی نہیں تھی، کالے دیو جیسا انجن تھا جو دھواں اُگلتا اور آگ برساتا ان کے قریب سے گزر گیا۔ ایک بار گاڑی بھی دکھائی دی تھی، مگر وہ پٹڑی بدل کر دوسرے پلیٹ فارم پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ گاڑی اپنی منزل کو روانہ بھی ہو چکی ہے۔ اس کے بعد بھی کئی گاڑیاں آئی ہیں، مگر وہ سب دوسرے پلیٹ فارموں پر جا کر رُکی ہیں اور پھر اپنی اگلی منزل کے لیے روانہ ہو گئی ہیں۔ کالے دیو جیسا انجن بھی اس دوران کئی دفعہ چیختا چلّاتا ادھر سے گزرا ہے، مگر اس پلیٹ فارم کے مسافروں کو انجن کا نہیں' گاڑی کا انتظار ہے' اپنی اس گاڑی کا جس کے لیے وہ اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔

گاڑی ابھی تک نہیں آئی۔ مَیں پلیٹ فارم پر گلے میں بیگ لٹکائے کھڑا ہوں، میرے سامنے دھواں چھوڑتے ہوئے انجن ہیں یا اس پلیٹ فارم کے اطراف میں واقع دوسرے "پلیٹ فارم" ہیں، جہاں گاڑیاں آ کر رُکتی ہیں اور پھر اپنی اگلی منزل کے لیے روانہ ہو جاتی ہیں، لیکن جہاں مَیں ہوں وہاں لوگ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اس گاڑی کی راہ تک رہے ہیں جو انہیں ان کی منزلِ مقصود تک پہنچائے گی۔ مَیں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں اور مجھے یقین ہے یہ گاڑی ضرور آئے گی۔

گاڑی ضرور آئے گی، مگر اس گاڑی کے آنے سے پہلے میں نے سفر کی رُوداد لکھ دی ہے، اس سفر کی جو میں نے نہیں کیا، اگر اس رُوداد میں کوئی خامی ہے، کسی جگہ کوئی تضاد نظر آتا ہے، واقعات میں ہم آہنگی نہیں ہے، کردار گڈمڈ ہو گئے ہیں یا کہیں صورتِ حال پوری طرح واضح نہیں ہوئی، تو اس پر کسی کو رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جو سفر نہ کیا ہو اس کی رُوداد ایسی ہی ہوتی ہے۔

کیا پیوگے؟

لاہور ریلوے اسٹیشن پر جب تمام رکشا ڈرائیوروں نے مجھ نالائق کا "بارِ امانت" اٹھانے سے انکار کر دیا تو میں اور حسنین جاوید ذرا پرے کھڑی ویگن میں جا کر بیٹھ گئے جس میں ہمارے علاوہ دو تین مسافر اور تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور منی بس میں مسافروں کے بے پناہ ہجوم سے متعلق بے بنیاد افواہوں پر غور کرنے لگا۔ اتنے میں چند مسافر اور آ گئے اور یوں منی بس قریباً بھر گئی۔ ڈرائیور کے برابر والی نشستیں خالی تھیں، لیکن کچھ ہی دیر بعد دو خواتین وہاں آ کر بیٹھ گئیں اور یوں ویگن کی بارہ نشستیں مسافروں سے پُر ہو گئیں۔ کنڈیکٹر ابھی تک دروازے کے ساتھ کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ میں نے بھری ہوئی ویگن کی طرف اشارہ کیا اور اسے چلنے کو کہا اس پر کنڈیکٹر کے چہرے پر جو مسکراہٹ نمودار ہوئی اس کا مفہوم کچھ اس طرح کا تھا کہ حضرت! آپ خاصے چغد واقع ہوئے ہیں۔ اتنے میں چند مسافر اور آ گئے۔ کنڈیکٹر نے ویگن میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو حکم دیا کہ وہ سکڑ جائیں سو وہ سکڑ گئے۔ اب ویگن میں بارہ کے بجائے سولہ مسافر براجمان تھے، لیکن کچھ اس طرح کہ انہوں نے اپنے کندھے سکیڑے ہوئے تھے، ہاتھ کھُلے ہونے کے باوجود بندھے ہوئے تھے؛ چنانچہ ان کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ ٹکٹ کے لیے پیسے نکالنے کی خاطر اپنی یا کسی دوسرے کی جیب میں

ہاتھ ڈال سکیں۔

میرا دم گھٹنے لگا تھا، چنانچہ میں نے ایک بار پھر کنڈیکٹر سے چلنے کی درخواست کی۔ اس بار اس نے مسکراہٹ کی دولت مجھ پر نچھاور کرنے کے بجائے الفاظ کے موتی بکھیرے اور کہا: "صاحب جی! ویگن بھرے گی تو چلیں گے، خالی ویگن کیسے لے جائیں؟" اتنے میں پانچ مسافر مزید آ گئے۔ کنڈیکٹر نے آواز لگائی: "سکڑ جائیں!" سو لوگ سکڑ گئے اور اب بارہ نشستوں کی ویگن میں اکیس بے زبان سوار تھے۔ دریں اثنا دو مسافر اور آ گئے۔ اس بار کنڈیکٹر نے ازراہِ کرم کسی کو سکڑنے کا حکم نہیں دیا۔ ایک مسافر پہلے سے بکری بنا کھڑا تھا، یہ دو بکریاں بھی اس کے ساتھ متوازی کھڑی ہو گئیں۔ اب دروازہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ کنڈیکٹر اس ادھ کھلے دروازے میں کھڑا ہو گیا اور ۲۳ بھیڑ بکریوں پر اس نے ایک فاتحانہ نظر ڈالنے کے بعد ہماری طرف دیکھا اور کہا: "صاحب جی! آپ ناراض نہ ہوں ہم چل پڑتے ہیں۔"

ظاہر ہے کنڈیکٹر کی اس خوش اخلاقی کے بعد ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نیز اس نے جس خوش اسلوبی سے مسافروں کی پیکنگ کی تھی اس نے ناراض ہونے کی گنجائش ویسے بھی نہیں چھوڑی تھی۔ سو صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ میرے سامنے والی نشست پر پانچ مسافر بیٹھے تھے۔ یہ نشست ایک پھٹے پر مشتمل تھی اور یہ پھٹا وہاں بنایا گیا تھا جہاں ہماری نشست کے مسافروں کے لیے ٹانگیں پھیلانے کی جگہ تھی، چنانچہ اب اس پھٹے کے مسافروں کی ٹانگیں خاصے شرمناک انداز میں "من تو شدم، تو من شدی" ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف بائیں جانب بکریوں کی طرح جھکے ہوئے انسانوں کی "سریاں" ہمارے سروں

پر سایہ فگن تھیں اور گاہے گاہے ان کے "پائے" ہمارے پاؤں پر آجاتے تھے۔ ہماری نشست پر انتہائی بائیں جانب بیٹھا ہوا شخص ہم سے زیادہ عذاب میں تھا، اس کا سر قدرت کی طرف سے منڈا ہوا تھا اور چندیا لشکارے مار رہی تھی، چلتے چلتے جب ویگن ڈرائیور اچانک بریک مارتا تو اس کے برابر میں بکری بنے مسافروں میں سے کسی ایک کا ہاتھ سہارا لینے کے لیے ٹھاپ کی صورت میں اس کے سر پر پڑتا اور وہ دانت پیس کر رہ جاتا کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

میرا دم گھٹتے گھٹتے "گھٹنے" کے قریب پہنچ گیا تھا، سو میں نے مزنگ چونگی کے قریب ڈرائیور کو بریک لگانے کے لیے کہا، ڈرائیور نے اچانک بریک لگائی، جس کے ساتھ ہی ٹھاپ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی میں پانچ منٹ کی جدوجہد کے بعد اس شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہوا اور پھر ویگن سے باہر کھڑے ہو کر میں نے کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں سیدھا اپنے ایک انقلابی دوست کے پاس گیا اور کہا: "آج سے میں بھی انقلابی ہوں، آؤ مل کر مسلح جدوجہد کا آغاز کریں اور نعرہ لگائیں کہ دنیا بھر کے ویگن مسافرو! ایک ہو جاؤ۔" میرے انقلابی دوست نے یہ سن کر ۵۵۵ کا سگرٹ سلگایا، ڈرائیور کو کار سروس کے لیے لے جانے کا حکم دیا اور پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا: "میرا اور تمہارا طبقہ الگ الگ ہے۔ میں مزدوروں اور کسانوں کا ساتھی ہوں، تم سرمایہ داروں کے رفیق ہو۔ ہمارا تمہارا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ خیر چھوڑو دن ڈھلنے کو ہے کیا پیو گے؟"

جہاں مَیں ہُوں

مَیں جس کرائے کے مکان میں رہتا ہُوں اس کے دو حصّے ہیں۔ میری رہائش اوپر کے حصّے میں ہے نیچے مالکِ مکان رہتا ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے یونین کمیٹی کا دفتر ہے۔ اس کے ساتھ ایک پلاٹ ہے اور اس پلاٹ کے برابر میں مسجد ہے۔ اس یونین کمیٹی، خالی پلاٹ اور مسجد کی دوسری طرف قبرستان ہے۔ قبرستان کے ساتھ دو تین مکان چھوڑ کر تھانہ ہے جس کا دروازہ مین روڈ کی طرف ہے۔

میرے گھر کے سامنے واقع یونین کمیٹی کا دفتر خاصی کثیر المقاصد قسم کی چیز ہے یہاں پیدائش اور موت کا اندراج بھی ہوتا ہے، انسدادی ٹیکے بھی لگائے جاتے ہیں۔ صفائی کا شعبہ بھی یہیں ہے۔ کچھ دنوں سے یہاں شناختی کارڈ بھی بنائے جا رہے ہیں —— اور پھر یونین کمیٹی کے برابر والے پلاٹ میں پلاٹ کے مالک نے مکان کی بنیادیں بھری ہوئی ہیں۔ مَیں جب سے یہاں ہوں، ان بنیادوں کو اسی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔

اس پلاٹ کے ساتھ واقع مسجد ظاہر ہے عبادت کے لیے تعمیر کی گئی ہے۔ یہاں سے پنج وقتہ اذان بھی بلند ہوتی ہے، لیکن نمازیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مؤذن اذان دینے کے علاوہ لوگوں کے گھریلو کام کاج بھی کرتا ہے

اور اس کا معاوضہ صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں وصول کرتا ہے
امام صاحب نے مسجد سے ملحقہ دکانوں میں سے ایک دکان کرایہ پر لی ہوئی ہے
یہ جنرل سٹور ہے جہاں امام صاحب خود یا ان کا چھوٹا بیٹا بیٹھتا ہے۔ خطیب صاحب
ان کے علاوہ ہیں جو صرف جمعے کا خطبہ دیتے ہیں۔ یہ نابینا ہیں۔ انہیں پنجابی،
اُردو اور فارسی کے بے شمار شعر اور حکایتیں یاد ہیں جو وہ لہک لہک کر سناتے
ہیں۔

یونین کمیٹی، پلاٹ اور مسجد کی دوسری طرف واقع قبرستان خاصا طویل و
عریض ہے۔ اس کے چاروں طرف دیوار کھنچی ہوئی ہے اور اندر سنگِ مرمر اور
مٹی کی قبریں ہیں ـــــ قبرستان سے چند گز کے فاصلے پر واقع تھانہ ظالموں اور
مظلوموں سے بھرا رہتا ہے اور ادھر سے گزرتے وقت کبھی کبھار کانوں میں سیسے
کی طرح اترنے والی چیخیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

مَیں چھٹی کے روز اپنے گھر کی بالکونی میں کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا ہوں اور
ہولے ہولے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے نیچے سڑک پر برپا ہونے والے ہنگاموں
کو دیکھتا ہوں۔ یونین کمیٹی کی دہلیز پر بہت سے خاکروب بیٹھے یا کھڑے داروغۂ
صفائی کی ڈانٹ ڈپٹ سُن رہے ہوتے ہیں۔ یہ روٹین کا معاملہ ہے۔ لہٰذا وہ
اس کا بُرا نہیں مناتے اور نہ اس کا کوئی اثر لیتے ہیں؛ چنانچہ وہ اس ڈانٹ ڈپٹ
کے دوران ماچس کی تیلی سے کانوں سے میل نکالنے میں مشغول رہتے ہیں اور یہ
ڈانٹ ڈپٹ اگر طول پکڑ جائے تو اسی تیلی سے سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے سُوٹے
لینے لگتے ہیں۔ یہاں لوگ شناختی کارڈ بنوانے کے لیے بھی آ جا رہے ہوتے
ہیں اور کچھ ٹیکہ لگوانے یا موت یا پیدائش کا سرٹیفکیٹ لینے کے لیے جمع

ہوتے ہیں۔ برابر والے پلاٹ میں بچے کھیل کود میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مکان کے لیے بھری ہوئی بنیادوں پر توازن برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں اور اگر اس کھیل کے دوران کوئی گر جائے تو اس پر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ لوگوں کا سودا سلف لانے والا موذن جب اذان دیتا ہے، تو کچھ لوگ اس کی آواز پر گھروں سے نکلتے ہیں اور امام صاحب دکان پر اپنے ننھے منے بچے کو بٹھا کر امامت کے لیے دکان سے مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

سو! جہاں میں رہتا ہوں، وہاں ایک یونین کمیٹی کا دفتر ہے، جہاں سے شناختی کارڈ بھی جاری ہوتے ہیں کہ اب ہماری شناخت، شناختی کارڈ سے ہے۔ یہاں موت اور پیدائش کے سرٹیفکیٹ بھی جاری کیے جاتے ہیں کہ ہماری زندگی اور موت کی تصدیق سرکاری کاغذوں ہی سے ہوتی ہے۔ جہاں میں ہوں وہاں ایک مسجد ہے جس کا موذن بے نوا ہے اور اذان دیتا ہے۔ جہاں میں ہوں، وہاں ایک قبرستان ہے جس میں سنگِ مرمر اور مٹی کی قبریں ہیں۔ اس کے برابر میں تھانہ ہے جس کے قریب سے گزرتے ہوئے انسانی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ اور جہاں میں ہوں، وہاں ایک پلاٹ ہے جس میں کب سے ایک خوبصورت مکان کی بنیادیں بھری ہوئی ہیں، لیکن اس پر ابھی تک کوئی عمارت تعمیر نہیں ہوئی۔

دو کوڑی کا نجومی

بادشاہ نے وزیرِ با تدبیر کو بلایا اور کہا کہ تدبیر ساتھ لے کر آؤ۔ بادشاہ نے مشیرِ باشمشیر کو بھی بلایا اور کہا کہ شمشیر ساتھ لے کر آؤ۔

وزیر نے تدبیر کی گٹھڑی باندھی اور بادشاہ سلامت کے حضور پہنچ گیا۔ مشیر نے شمشیر ساتھ لی اور بادشاہ کے آستانے پر حاضری دی۔

بادشاہ نے وزیر سے کہا: "تمہارے پاس کیا تدبیر ہے؟"

وزیر نے گٹھڑی کھولی اور جواب دیا: "حضور! ایک نہیں کئی تدبیریں ہیں۔ پہلی تدبیر یہ ہے کہ آپ مکمل طور پر شاہانہ زندگی بسر کریں۔ اچھے کر و فر کے لیے شاہی خزانے کو بے دریغ استعمال کریں۔ اپنے درباریوں کے لیے لوٹ کھسوٹ کے تمام دروازے کھول دیں، نیز بدعنوانی اور لاقانونیت کو جی بھر کر فروغ دیں کہ شاہانِ سلف کا یہی دستور رہا ہے۔"

بادشاہ سلامت نے یہ سنا تو وہ خوش ہوئے اور بولے: "ہمیں تم سے اسی وفاداری کی اُمید تھی، لیکن تمہارے ان مشوروں پر عمل کرنے سے رعایا میں بے چینی پھیلے گی اور وہ ہمارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے، کیا خیال ہے؟"

وزیرِ باتدبیر نے یہ سنا تو کورنش بجا لایا اور بولا: "حضور! وہ طبقے جو آپ کے ساتھ لوٹ کھسوٹ میں شریک ہوں گے۔ آپ کے اقتدار کو مضبوط کرنے

میں مدد دیں گے، البتہ رعایا کو مطمئن کرنے کے لیے آپ صرف یہ کریں کہ گاہے بگاہے ان کے بارے میں ہمدردی اور محبت کے کلمات استعمال کرتے رہیں۔ وہ اس سے خوش ہو جائیں گے، کیونکہ آپ سے پہلے کسی نے زبانی کلامی بھی ان سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ یوں آپ ظالم اور مظلوم دونوں کو خوش رکھ سکیں گے"

بادشاہ سلامت کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انہوں نے فرمایا: "وزیرِ باتدبیر! تم ٹھیک کہتے ہو، کوئی اور تدبیر؟"

وزیر نے گٹھڑی میں سے ایک اور تدبیر نکالی اور کہا: "حضور! ایک تدبیر یہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے مطابق آپ کو چاہیے کہ انصاف کے تمام راستے مسدود کر دیں تاکہ فریادیوں کی فریادیں بھی کانوں تک نہ پہنچنے پائیں اور آوازیں سینوں ہی میں گھُٹ کر رہ جائیں۔"

بادشاہ سلامت نے وزیرِ باتدبیر کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے زر و جواہر اور خلعت دے کر رخصت کیا۔

پھر وہ اپنے مشیر کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: "مشیر، تم ہمیں کیا مشورہ دیتے ہو؟"

مشیر نے اپنی شمشیر نکالی اور کورنش بجا لا کر کہا: "حضور کا اقبال بلند ہو، میرا صرف ایک مشورہ ہے کہ جو لوگ وزیرِ باتدبیر کی ان تدبیروں کے باوجود سرکشی پر مائل ہوں انہیں بے دریغ تہ تیغ کر دیا جائے۔ اس کے بعد کسی کو سر اٹھانے کی جُرأت نہ ہو گی!"

بادشاہ سلامت نے مشیر کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے بھی زر و جواہر اور خلعت سے سرفراز کیا۔

پھر بادشاہ سلامت نے ایک روز وزیر کو بلایا اور کہا: "مشیر نے مجھے تمہیں قتل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ تم مجھے کتنے عزیز ہو۔"

اور بعد میں بادشاہ سلامت نے مشیر کو طلب کیا اور کہا: "وزیر تمہیں راستے سے ہٹانے کی تدبیر کر رہا ہے، اس کی سازشوں سے محتاط رہو، ویسے مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے۔"

اس کے نتیجے میں درباری دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور مخالف کو نیچا دکھانے کے لیے خود کو شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ثابت کرنے لگے اور یوں بادشاہ سلامت نے زیادہ یکسوئی کے ساتھ امورِ سلطنت انجام دینا شروع کر دیے۔ انہوں نے اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لیے تدبیر اور شمشیر دونوں کو استعمال کیا، جس کے نتیجے میں انہوں نے ایک عرصے تک شاہانہ زندگی بسر کی، شاہی خزانے کو بے دریغ استعمال کیا، اپنے درباریوں کو بھی لوٹ کھسوٹ کی مکمل آزادی دی اور ملک میں لاقانونیت اور بدعنوانی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

پھر ایک روز بادشاہ سلامت کے مخبروں نے انہیں آکر خبر دی کہ غریب عوام جن کی آزادیاں اور زندگیاں اجیرن ہو گئی ہیں، سرکشی پر آمادہ ہیں۔ بادشاہ نے یہ سُنا تو مخبروں کی غلط خبری پر انہیں سرزنش کی، پھر شاہی نجومی کو بلایا اور پوچھا کہ تمہارے ستارے کیا کہتے ہیں۔

نجومی نے یہ سُن کر کھڑکی میں سے سر باہر نکالا اور پھر بادشاہ سلامت کو مخاطب کر کے کہا: "حضور! اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ آپ کا اقتدار چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔"

بادشاہ سلامت یہ سن کر جلال میں آ گئے۔ انہوں نے غصّے سے کانپتے ہوئے کہا: "اے دو کوڑی کے انسان! کیا تیرے ستاروں نے تجھے یہی بات بتائی ہے؟"

نجومی نے ایک بار پھر جان کی امان طلب کی اور کہا: "حضور! یہ بات مجھے میرے ستاروں نے نہیں بتائی، میں نے ابھی کھڑکی کے باہر حضور کے محل کی دیواروں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے لاکھوں عوام کا ہجوم دیکھا ہے، ان کے چہرے نفرت سے کھنچے ہوئے ہیں۔"

یہ سُن کر بادشاہ سلامت کے چہرے پر تشویش کے آثار پیدا ہوئے انہوں نے فوراً وزیر اور مشیر کو طلب کیا۔

وزیر نے "تدبیر کی گٹھڑی کھولی اور کہا: "حضور! فکر کی کوئی بات نہیں۔"

مشیر نے اپنی شمشیر نکالی اور کہا: "حضور! فکر کی کوئی بات نہیں۔"

اور دو کوڑی کے نجومی نے ان دونوں کو دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر سر نکال کر لاکھوں عوام کے اس غضبناک ہجوم کو دیکھنے لگا جو نفرت سے بھرے ہوئے چہروں کے ساتھ محل کے دروازے کے باہر جمع ہو رہے تھے۔

مجمع باز

ٹی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے ایک ادیب نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کر پیالی واپس پلیٹ میں رکھی اور میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا "تمہیں پتہ ہے کہ میں بننا مجمع باز چاہتا تھا، مگر بن ادیب گیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اس کی ہنسی میں شامل ہوتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اس کے لہجے سے تاحال اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا ہے یا وہ اس وقت مذاق کے موڈ میں ہے۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں" اس نے داہنے ہاتھ سے اپنے بال ماتھے پر سے سمیٹتے ہوئے اسی طرح قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "جب میں بی اے میں پڑھتا تھا تو فٹ پاتھ پر مجمع لگانے والے "مقرروں" کی تقریریں بڑی دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ تقریر کے اختتام پر ان میں سے کوئی سرمہ بیچتا، کوئی دانتوں کا منجن فروخت کرتا اور کسی کی تان بوڑھوں کو جوان بنانے والی دوا پر ٹوٹتی۔ بعد میں ان میں سے ایک مجمع باز سے میری دوستی ہو گئی جس کی اپنی ذاتی کوٹھی تھی اور جب وہ دوسرے شہروں میں مجمع لگانے کے لیے دورے پر نکلتا تو کسی صاف ستھرے ہوٹل میں قیام کرتا۔ اس کا "سٹاف" دو افراد پر مشتمل تھا جو مجمع گاہ میں آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ جاتا اور ان میں سے ایک لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے ابتدائی نوعیت کی تقریر کرتا، اتنی دیر میں کچھ لوگ جمع

ہو جاتے تو ان کا باس جس کا چہرہ سرخ و سفید تھا اور جو بارعب شخصیت کا مالک تھا، پستول کمر کے ساتھ باندھے وہاں پہنچ جاتا اور "جوہرِ حیات" نام کی بوتلیں اپنی صحت کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے بیچتا۔ اس کی تقریر اتنی دلپذیر ہوتی کہ کم از کم پچاس بوتلیں وہیں فروخت ہو جاتیں، چنانچہ دو روپے فی بوتل کے حساب سے وہ سو روپے جیب میں ڈال کر اپنے سٹاف کو کسی اور جگہ کا پتہ دیتا اور پھر آدھ گھنٹے بعد خود ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں مجمع لگانے کے لیے پہنچ جاتا۔ یہ آج سے کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہے اور وہ اس زمانے میں بھی کم از کم تین چار سو روپے روز کے کماتا تھا۔"

"مگر تم تو اپنے بارے میں کچھ بتانے والے تھے؟"

"ہاں یہی تو بتانے لگا ہوں" وہ ایک بار پھر ہنسا۔ "دراصل ایک دن میں نے اسے یہ جوہرِ حیات تیار کرتے دیکھا جو بوڑھوں کو جوان اور جوانوں کو نوجوان بناتا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں اس نے میری موجودگی کے دوران اپنے ملازم کو یہ جوہرِ حیات تیار کرنے کی ہدایت کی جس پر یہ ملازم جو ٹُنڈا تھا فوراً اٹھا، ایک بڑی بالٹی پانی سے بھری اس میں کچھ سکرین اور تھوڑا سا رنگ ملایا اور ایک مٹھ چھان بورے سے ملتی جلتی کوئی چیز اس میں مکس کی۔ اس کے بعد اس نے اپنا واحد ہاتھ بالٹی میں ڈال کر پانی زور زور سے ہلایا اور اب یہ "جوہرِ حیات" ٹانک تیار تھا۔ خالی بوتلیں اس کے پاس دھری تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے بوتل بالٹی میں ڈالتا۔ غٹ غٹ غٹ کی آواز آتی اور بوتل بھر جاتی۔ بعد ازاں اس نے ان بوتلوں پر "جوہرِ حیات" کا خوبصورت لیبل چسپاں کیا جس کے نیچے "غلط ثابت کرنے والے کو ایک سو روپے انعام" لکھا تھا۔ اور انہیں ایک اٹیچی میں پیک کر دیا۔ رنگ، سکرین، چھان بورے

اور پانی سے بھری بالٹی آدھی سے زیادہ بچ گئی تھی جو اس نے وہیں الٹا دی تھی اور یوں باقی ماندہ "جوہرِ حیات" نالی میں بہہ گیا۔

"سبحان اللہ" اس سارے قصّے کے دوران پہلی بار میرے چہرے پر مسکراہٹ ابھری اور اب اس کہانی کے اصل حصّے میں میری دلچسپی بھی مزید بڑھ گئی چنانچہ میں نے کہا "مگر تم تو اپنے بارے میں کچھ بتانے والے تھے"۔

"اب میں وہی بتانے لگا ہوں"۔ اس نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیتے ہوئے کہا "بس وہیں میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں نے اپنا کیریئر بنانا ہے تو ایک مجمع باز کے طور پر ہی بنانا ہے۔ میں نے اس دوران گریجوایشن کر لی تھی اور نوکری مل نہیں رہی تھی، چنانچہ اگلے روز میں اپنے ایک دوست کے پاس گیا جو پی کیو آر میں اے ایس آئی تھا اور بے روزگار تھا"۔

"یہ کیا بات ہوئی" میں نے اپنے اس ادیب دوست کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا "اگر وہ پی کیو آر میں اے ایس آئی تھا تو بے روزگار کیسے تھا"۔

"وہ اس طرح کہ پی کیو آر کے نام سے "پولیس قومی رضا کار" دراصل ایک فورس تھی جو اس زمانے میں قائم تھی اور اس کے اے ایس آئی کی وردی پولیس کے اے ایس آئی کی وردی کی طرح ہی ہوتی تھی، مگر ان اے ایس آئی صاحبان کی تنخواہ صرف ۲۰ روپے ماہوار تھی، میرا یہ دوست اپنے باقی اخراجات پولیس کی وردی کی دھاک بٹھا کر بذریعہ فراڈ پورے کرتا تھا"۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے محسوس کیا کہ اس دخل درمعقولات سے کہانی کا "ٹیمپو" (TEMPO) کچھ سلو ہو گیا ہے۔

"پھر یوں ہوا کہ ہم نے دانتوں کی دوا بیچنے کا پروگرام بنایا"۔

"ارے تم دانتوں کا منجن بیچتے رہے ہو" میرے حلق سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔

"یار سنو تو سہی" خود اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اس پروجیکٹ کے لیے میں نے بازار سے چھوٹے سائز کی دو شیشیاں خریدیں۔ ایک بالٹی میں پانی بھرا، اس میں تھوڑی سی کھٹائی جو گول گپوں کے پانی میں ڈالتے ہیں ملائی، تھوڑا سا زردے کا رنگ اس میں مکس کیا اور پھر دانتوں کو موتیوں کی طرح چمکانے والی دوا تیار تھی۔"

"اس دوائی پر تمہاری لاگت کتنی آئی؟"

"یہی کوئی آٹھ آنے؟" اور یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر ہنسا۔

"پھر؟"

"پھر میں نے کوئی ڈیڑھ صفحے کی تقریر لکھی جس میں پانچ شعر بھی شامل تھے جن میں سے چار میرے اپنے اور ایک علامہ اقبال کا تھا اور بعد ازاں اسے زبانی یاد کرنے کے بعد کوئی ایک ہفتے تک اس کی ریہرسل کرتا رہا۔ یہ خاصا مشکل کام تھا، کیونکہ اس کے لیے لہجہ بھی خالص مجمع بازوں ایسا بنانا تھا۔ چنانچہ صرف ایک لفظ "دند دانت" کو مجمع بازوں کے انداز میں ادا کرنے کے لیے میرے کئی دن صرف ہو گئے۔" کیونکہ "دند" کا لفظ دانت پیس کر ادا کرنا تھا۔ یعنی دن ن د!"

اس گفتگو کے دوران شام ہونے کو تھی اور ٹی ہاؤس کی میزیں ایک ایک کر کے ادیبوں سے پُر ہونا شروع ہو گئیں۔ ان میں رنگارنگ ادیب تھے۔ ہر لیبل کے، ہر مارکہ کے۔ مگر اس وقت میرا دھیان ان کی طرف نہ تھا، بلکہ میں دعا کر رہا تھا کہ ان میں سے کوئی ہماری میز کی طرف رخ نہ کرے، چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر احتیاطاً ستون کے پیچھے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس داستان میں

بڑا مزہ آرہا تھا۔

اچھا پھر کیا ہوا؟"

"ہاں یہ تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا کہ ان دنوں میں پنڈی میں ہوتا تھا چنانچہ پنڈی کے کسی بازار میں مجمع لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، لہٰذا ہم نے اس کے لیے کیمبل پور جانے کا فیصلہ کیا، چنانچہ ہم نے پونے دو دو روپے کی ٹکٹ خریدی اور کیمبلپور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جس ڈبے میں ہم سوار ہوئے وہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ میرے "اے۔ ایس۔ آئی" دوست نے مجھے کہنی ماری اور آہستہ سے کہا "بسم اللہ اس ڈبے ہی سے کرو۔ تجربے کے لیے یہ بہترین جگہ ہے۔" لیکن اتنے سارے لوگ دیکھ کر میری ہمت جواب دے گئی، چنانچہ اس کے اصرار پر جب میں نے اپنی جگہ سے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو مجھے یوں لگا میرے پاؤں من من کے ہو گئے ہیں، لہٰذا میں پھر واپس بیٹھ گیا اور میں نے اپنے دوست سے کہا کہ کسی دوسرے ڈبے میں چلتے ہیں، مگر دوسرے ڈبے میں بھی میری کیفیت جوں کی توں رہی، مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگ میرے واقف ہیں۔ اس دوران مسافر ایک ایک کر کے مختلف اسٹیشنوں پر اترتے جا رہے تھے حتیٰ کہ اس ڈبے میں صرف تین مسافر رہ گئے جن میں سے دو بوڑھے اور ایک جوان تھا۔ میرے دوست نے مجھے ٹہوکا دیا اور کہا یار خدا کے لیے ہمت کرو۔ اب سنہری موقع ہے، چنانچہ اس کے حوصلہ دلانے پر میں نے اپنی تمام قوتیں مجتمع کیں حتیٰ کہ ایک ہاتھ میں بیگ پکڑ کر میں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔"

اب مختلف میزوں سے ادیبوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں اور وہ اپنے اپنے دلپسند موضوعات پر بآواز بلند اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ دو تین میزوں

پر بحث میں تو غالباً تلخی بھی پیدا ہو گئی تھی، کیونکہ ایک ادیب کی ہسٹریائی چیخیں ہماری میز کی حدود میں داخل ہو گئی تھیں۔ شریف بنجارہ، الٰہی بخش اور بیرے چائے کے برتن اٹھائے تیزی سے ایک میز سے دوسری میز کی طرف آجا رہے تھے۔

"پھر کیا ہوا؟" اس دفعہ میں نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا، کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ میری آواز اس شور میں گم ہو جائے گی۔

"پھر یوں ہوا کہ میں نے اپنی تقریر دلپذیر کا آغاز کیا، مگر صورتِ حال یہ تھی کہ میرے ہونٹ کپکپا رہے تھے، ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ماتھے پر پسینہ ہی پسینہ تھا، چنانچہ اپنی رٹی ہوئی تقریر کے پہلے تین جملے اور ایک شعر کے بعد باقی تقریر مجھے بھول گئی جس پر میں نے یہ کہہ کر تقریر فوراً ختم کر دی کہ حضرات دراصل میں دانتوں کی دوا بنانے والی ایک مشہور کمپنی کا ایجنٹ ہوں اور کمپنی کی مشہوری کے لیے یہاں یہ دوا صرف آٹھ آنے میں آپ کو ملے گی۔ اس کا اثر دیکھنا ہو تو ابھی دیکھئے میں آپ کو دکھاتا ہوں اور یہ کہہ کر میں نے کھٹیانی والے اس رنگین پانی میں روئی ڈبو کر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک بزرگ سے کہا۔ باباجی ذرا منہ کھولو۔ اس نے فوراً منہ کھول کر دکھا دیا جس میں سرے سے کوئی دانت نہ تھا۔ اس پر میں نے کھسیانا ہو کر کہا بہرحال جن صاحب کو ضرورت ہو وہ آواز دے کر طلب کریں۔ صرف آٹھ آنے میں، یہ رعایت صرف کمپنی کی مشہوری کے لیے ہے۔ اس پر میرے ساتھی نے پروگرام کے مطابق جیب سے اٹھنی نکالی اور کہا بھائی صاحب ایک شیشی مجھے دینا۔ میں نے ایک شیشی اس کے ہاتھ فروخت کی۔ اور بس یہی ایک شیشی فروخت ہوئی۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے ایک فلک شگاف نعرہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

"پھر کیا ہونا تھا کمبل پورہ آیا تو ہم اتر گئے، لیکن میں اس تجربے سے اس قدر

ڈیمورلائز (DEMORALISE) ہوا کہ اپنے ساتھی کے شدید اصرار کے باوجود میں نے وہاں مجمع لگانے سے انکار کر دیا، لیکن وہاں ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا!"

"وہ کیا؟"

"پنڈی سے کیمبل پور کی ٹکٹ لینے کے بعد میری جیب میں صرف دس روپے بچے تھے اور میرے خیال میں یہ رقم کافی تھی کیونکہ دانتوں کو موتیوں کی طرح چمکانے والی دوا کی دو سو شیشیاں بھی تو میرے بیگ میں تھیں جن کے متعلق مجھے یقین تھا کہ میں آرام سے سو روپیہ اس میں سے کما لوں گا لیکن شیشی ایک نہ بکی اور جب کیمبل پور پہنچ کر کھانا کھانے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا کہ ڈبے میں اللہ کسی نے میری جیب کاٹ لی تھی۔"

میرا قہقہہ ایک دفعہ پھر بہت زوردار تھا لیکن وہ دو تین مختلف میزوں پر بیٹھے علیحدہ علیحدہ لیبلوں اور علیحدہ علیحدہ ٹریڈ مارک رکھنے والے ادیبوں کے جوش خطابت کی نذر ہو گیا۔ یہ ادیب اب گفتگو نہیں باقاعدہ تقریر کر رہے تھے، بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی میز پر مکّہ بجنے کی آواز بھی سنائی دیتی اور اس کے ساتھ ہی اس میز پر پڑی پیالیاں چھنچھنا اٹھتیں:

"پھر تم لوگ واپس کیسے آئے؟"

"وہ تو ہم کسی نہ کسی طور پر آ گئے" میرے اس ادیب دوست نے مجھ سے ماچس لے کر سگریٹ سلگایا۔ پھر ہنستے ہوئے کہا "مگر یار افسوس یہ ہے کہ میں محض تربیت نہ ہونے کی وجہ سے اس میدان میں مار کھا گیا۔ اگر کوئی اچھا استاد مل جاتا تو مجھے اپنے مقصد میں بھی کامیابی ہو جاتی اور آج مجھے بطور ادیب جو عزت حاصل ہے اس میں بھی کوئی کمی نہ آتی!"

"وہ کیسے ؟" اپنے اس مسخرے دوست کی اس بات پر میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"وہ یوں کہ اب جو میں عرصہ دراز سے روزانہ شام کو ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کرتا ہوں اور ہفتے میں منعقد ہونے والے دو تین ادبی حلقوں کے اجلاس میں ادیبوں کو گلا پھاڑ پھاڑ کر گفتگو کرتے ہوئے سنتا ہوں۔ اگر اس وقت مجھے ان لوگوں کی صحبت اور تربیت میسّر ہوتی تو مجھے اپنے مشن میں ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اب میں صرف ادیب ہوں۔ اس صورت میں مجمع باز بھی ہوتا اور چار پیسے اس فن سے بھی کما لیتا۔ یہ جن کی آوازیں تم تک آ رہی ہیں، یہ بھی ترچند رٹی رٹائی اصطلاحوں پر "جوہر حیات" کا لیبل لگا کر انہیں بیچنے کے لیے ٹی ہاؤس، ادبی حلقوں، ریڈیو اور ٹیلیویژن میں مجمع لگاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ادیب بھی کہلاتے ہیں۔ میں تو یار اس وقت بس نادانی ہی میں مارا گیا!"

بندے دا پُتّر

گزشتہ روز مَیں نے یاسر اور عمر کی انگلی پکڑی، گلزار وفا چودھری کو ساتھ لیا اور چڑیا گھر کے مرکزی دروازے سے گزر کر ہم جانوروں کے پنجروں کے قریب پہنچ گئے۔ اس روز جمعہ کی وجہ سے چڑیا گھر میں خاصی رونق تھی، بے شمار لوگ اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ مختلف پنجروں کے ساتھ لگے کھڑے تھے اور جانوروں کو دیکھ کر محظوظ ہوتے تھے، کچھ کو جانور دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ ببّر شیر کے پنجرے کے گرد لوگوں کا خاصا ہجوم تھا، مگر "بادشاہ سلامت" سو رہے تھے۔ ان کے تین خوبصورت بچّے برابر میں لیٹے تھے، ان میں سے دو تو محوِ خواب تھے، ایک جاگ رہا تھا۔ شیرنی ذرا فاصلے پر لیٹی تھی اور بار بار غصیلی آنکھوں سے ناظرین کو دیکھتی تھی۔ اسے "نامحرموں" کی یہ تاک جھانک غالباً ناگوار گزر رہی تھی۔ مَیں نے ایک نظر اس "فیملی" پر ڈالی اور پھر گلزار سے کہا "یہ خاندان کتنی پُرسکون زندگی گزار رہا ہے۔ بس یہاں ایک ٹیلیویژن سیٹ بھی ہو تو اس فیملی کی شام بھی ذرا اچھی گزر جائے"۔

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو" گلزار نے ہنس کر کہا "چنانچہ چڑیا گھر والے اگر ان کے لیے ٹی وی سیٹ "افورڈ" نہ کر سکتے ہوں، تو ان "میاں بیوی" کو "نیلام گھر" بھیج دیں وہاں یہ طارق عزیز سے منیر نیازی کے شعر بھی سنیں گے اور ٹیلیویژن سیٹ

بھی انہیں مل جائے گا!"

عمر میرے گھٹنے کے ساتھ لگا کھڑا تھا، اسے پنجرے کے مکین صاف نظر نہیں آ رہے تھے چنانچہ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس نے گود میں آتے ہی ببر شیر کو متوجہ کرنے کے لیے اپنے حلق سے شیر جیسی آواز نکالی جس پر شیرنی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، مگر اس کی آنکھوں میں مامتا نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ درندوں میں مامتا زیادہ سے زیادہ اپنے بچوں کے لیے ہوتی ہے، دوسرے کے بچوں کے لیے نہیں!

"تمہیں پتہ ہے کہ یہ جوڑا اتنی مطمئن زندگی کیوں بسر کر رہا ہے؟" گلزار نے مجھے استفہامیہ انداز میں مخاطب کیا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہا "اس لیے کہ اس پنجرے میں بیوی کو اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں، یہ وہ شیر ہے جو رات کو لیٹ گھر نہیں آتا اور یہ وہ شیر ہے جس کی جیب سے کبھی کوئی رقعہ برآمد نہیں ہوا!"

اس دوران مختلف جانوروں سے "ہیلو ہیلو" کرتے ہوئے ہم ایک انتہائی خوبصورت سفید بلی کے پنجرے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

"یار! یہ بلی دیکھو کس قدر خوبصورت ہے، بھلا اسے پنجرے میں بند رکھنے کی کیا ضرورت ہے اسے تو یوں بھی لوگ گھروں میں دیکھ لیتے ہیں"۔ میں نے گلزار سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے" گلزار نے مسکراتے ہوئے کہا "مگر اسے یہاں بلی ہونے کی وجہ سے نہیں، شیر کی خالہ ہونے کی وجہ سے بند کیا گیا ہے۔ اسے صرف شیر کی رشتہ داری لے بیٹھی۔ بزرگوں نے اسی لیے تو کہا ہے کہ زور آوروں کے

ساتھ خواہ مخواہ کی رشتہ داری قائم نہیں کرنی چاہیے۔"

"اور چڑیا گھر کے شیروں کے ضمن میں تو خصوصاً احتیاط برتنا چاہیے" برابر میں کھڑے کوٹ پتلون میں ملبوس ایک سمارٹ سے نوجوان نے متبسّم چہرے کے ساتھ گلزار کے فقرے کو آگے بڑھایا!

اس عرصہ میں ہم چلتے چلتے "ہاتھی سٹینڈ" کے قریب پہنچ گئے جہاں بہت سے بچے ایک سیڑھی کے ذریعے ہاتھی پر سوار ہو رہے تھے۔ ہمارے سامنے گوشت کا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ میں نے یاسر اور عمر کو بھی اس مخلوق پر سواری کی دعوت دی، مگر انہیں یہ مخلوق غالباً زیادہ پسند نہیں آئی، کیونکہ وہ یہ سن کر فوراً میری ٹانگوں کے ساتھ چپک گئے۔

"اگر قدرت بھی 'حصّہ بقدر جُثّہ' کے اصول کی قائل ہوتی تو جانتے ہو کیا ہوتا؟" ذرا فاصلے پر کھڑے ایک شخص نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"کیا ہوتا؟" اس کے ساتھی نے کہا۔

"ہوتا یہ کہ اس وقت دنیا کی حکمرانی ہاتھیوں کے سپرد ہوتی، کیونکہ اس کا جُثّہ تمام حیوانوں اور انسانوں سے زیادہ ہے۔ پس ثابت ہُوا کہ ہر شخص کو اس کی ذہنی صلاحیّت کے مطابق اس کا حق ملنا چاہیے۔"

اس کے ساتھی نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی، لگتا تھا وہ اپنے دوست کی ان باتوں کا عادی ہے، مگر پھر اس نے ہولے سے کہا

"تو کیا دنیا کی حکمرانی آج بھی ہاتھیوں کے سپرد نہیں ہے؟"

اور پھر بندروں کے ساتھ خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے کے بعد اب ہم بن مانس کے پنجرے کے قریب کھڑے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پنجرے

کی سلاخیں پکڑی ہوئی تھیں اور ناظرین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا
لگتا تھا وہ ہم میں سے کسی ایک کو "جیلر" فرض کر کے ابھی سلطان راہی کے انداز
میں "او ئے جیلر" والے ڈائیلاگ بولنا شروع ہو جائے گا، مگر اس نے یہ موقع
غالباً مناسب نہ جانا۔ اس کے بجائے وہ دونوں ٹانگوں پر چلتا پنجرے کے
دوسرے کنارے تک گیا اور وہاں زمین پر پڑے بیک وقت چھ سات کیلے
ہاتھوں اور بغل میں دبا کر واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔

"یہ کیلے کھانے کے لیے لایا ہے یا تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے" گلزار
نے للچائی ہوئی نظروں سے کیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اتنے میں بن مانس نے نہایت مہذب انداز میں کیلے کا چھلکا اتارا اور پھر
اوپر کے حصے کا گودا کھانا شروع کر دیا۔ جب یہ گودا ختم ہو گیا تو اس نے باقی
چھلکا اتار کر پرے پھینک دیا اور گودا منہ میں ڈال کر ناظرین کی طرف منہ
کر کے باقاعدہ ہنسنا شروع کر دیا۔

"یار کمال ہے!" میں نے گلزار کو مخاطب کر کے کہا "بن مانس کو دیکھ کر
ڈارون کی تھیوری کچھ کچھ ٹھیک لگنے لگتی ہے۔ خصوصاً اس بن مانس کو دیکھ کر
تو مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ آئندہ چند برسوں میں اپنے تمام ارتقائی مراحل طے
کر کے یہ بن مانس سے "بندے دا پتر" بن جائے گا۔"

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو!" گلزار نے کہا "بلکہ میرا تو خیال ہے کہ
آئندہ دو چار سال میں یہ نہ صرف انسان بن جائے گا، بلکہ باقاعدہ حلقہ
اربابِ ذوق کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوا کرے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ
جتنا یہ ذہین لگتا ہے ممکن ہے کچھ عرصے بعد تم اسے ریڈیو، ٹی وی کے

مبصروں میں دیکھو کہ اللہ بہت انصاف کرنے والا ہے وہ ہر ایک کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق رزق دیتا ہے۔"

برف باری کا امکان

اتوار کی صبح کو اسلام آباد کا موسم بہت بھیگا بھیگا تھا۔ زاہد ملک نے آسمان کی طرف نگاہ ڈالی اور محمد منشایاد سے کہا "لگتا ہے اس وقت مری میں برف باری ہو رہی ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟" منشایاد نے بھی ایک نظر آسمان پر ڈالی اور اپنی ماہرانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میرا بھی یہی خیال ہے!" اس پر زاہد ملک نے یہ "فائل" میری طرف سرکائی اور پوچھا "مری چل کر برف باری دیکھنے کے متعلق کیا خیال ہے؟" ہم نے اس "فائل" پر ریمارکس لکھے "بہت اچھا خیال ہے فوراً امپلیمنٹ کیا جائے۔"

مری میں بلا کی سردی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوتے تھے مگر برفباری نہیں ہو رہی تھی۔ پرائم منسٹر ہاؤس کے سامنے ایک چاٹ بیچنے والے نے ہمیں دیکھ کر آواز لگائی "چاٹ، مزیدار چاٹ!" ہم نے گاڑی روکی اور پوچھا: "برف باری کا امکان ہے؟" اس نے کہا "اللہ نے چاہا تو بس ہونے ہی والی ہے۔" اس کے پاس ایک دس بارہ سال کا سرخ و سفید بچہ میلے کچیلے کپڑوں اور بڑے سائز کے لنڈے کے کوٹ میں ملبوس کھڑا تھا۔ ہم نے پوچھا "منے تمہاری کیا رائے ہے؟" اس نے کہا "بس جی ہونے ہی والی ہے۔" ہم نے برابر میں واقع ایک خوبصورت گھر کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا "یہ گھر کس کا ہے؟" منے نے

جواب دیا "یہ میرے صاب کا گھر ہے ، مَیں ان کا چوکیدار ہوں ۔"

"تم کہاں رہتے ہو ؟" ہم نے پوچھا۔

اس نے نیچے وادی میں چھوٹے چھوٹے نقطوں کی صورت میں نظر آنے والے گھروندوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "مَیں نیچے وادی میں رہتا ہوں میرا باپ مزدوری کرتا ہے ۔"

ہم نے پوچھا "تمہارا صاحب کیا کرتا ہے ۔"

" شراب بیچتا ہے ۔" اس نے کہا اور قمیص کا دامن اٹھا کر سردی سے سرخ ہونے والی ناک کو ملنا شروع کر دیا۔

مال روڈ پر چہل قدمی کرتے کرتے ہماری ٹانگیں یخ ہو گئی تھیں۔ خواتین کے بلبوسات کی دکان میں ہم سانس لینے کے لیے رکے اور دکاندار سے پُوچھا : "برف باری کا امکان ہے ؟" اس نے بادلوں کی طرف دیکھا۔ سردی کی ہلاکت خیزیاں محسوس کیں اور تمام علامتیں موجود پا کر کہا "بس جی ہونے ہی والی ہے !" وہاں سے نکل کر ہم ایک تکہ شاپ کی طرف گئے ، برابر کی دکان بھی تکہ فروش ہی کی تھی۔ اس کے ہنکارے نے آواز دی "بابو جی اِدھر آ جائیں ، فسٹ کلاس تکے ملیں گے ۔" لیکن ہم نے پہلی دکان کو ترجیح دی اور آرڈر دینے کے بعد پُوچھا "برف باری کا امکان ہے ؟" اس نے کوئلوں کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہا "بس جی ہونے ہی والی ہے ۔" پہلوان جی نے کوئلوں کو دہکانے کے لیے ٹیبل فین لگایا ہوا تھا۔ مشتاق یاد نے کہا "یہ کوئلوں کو نزلہ کرائے گا !" واپسی پر ہم نے برابر والی تکہ شاپ کے ہنکارے سے برف باری کے بارے میں پوچھا تو اس نے غصے سے جواب دیا "اللہ بہتر جانتا ہے ۔" مطلب یہ تھا کہ اور برابر والی دکان سے تکے کھاؤ !

برف باری کے بارے میں ہمارے تمام اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے اور تمام امیدوں پر پانی پھرتا نظر آ رہا تھا، مگر موسم میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہ آئی تھی اور وہ ہنوز برفباری کے امکانات کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ بچوں کے کھلونوں کی ایک دکان سے خرید و فروخت کے بعد ہم باہر آئے تو زاہد ملک کو اچانک کچھ یاد آیا وہ اندر گئے اور دکاندار کے کان میں پوچھا "برفباری کا امکان ہے؟" اور باہر آ کر انہوں نے بتایا کہ دکاندار کہتا ہے بس ہونے ہی والی ہے! سیمز میں سبز چائے کا آرڈر دینے سے پہلے ہم نے بیرے سے برف باری کی یقین دہانی حاصل کی اور بڑے بڑے شیشوں میں سے باہر متوقع برف پر نظریں جمائے قہوے کی چسکیاں لیتے رہے لیکن اب شام ہونے کو تھی چنانچہ ہم اسلام آباد واپس جانے کے لیے باہر آ گئے۔

کار میں بیٹھنے سے قبل ہم نے باری باری ایک دوسرے سے پوچھا "برفباری کا امکان ہے؟" تینوں نے یکے بعد دیگرے پورے وثوق کے ساتھ سر ہلا دیا اور کہا "بس ہونے ہی والی ہے" تاہم متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ برف باری کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ دیکھی جائے، لہٰذا واپس چلنا چاہیے۔

اسلام آباد پہنچ کر اگلے روز محمد منشا یاد نے مری میں متعینہ اپنے محکمے کے ایک ایس۔ ڈی۔ او کو فون کیا اور پوچھا "برف باری کا امکان ہے؟" دوسری طرف سے جواب آیا: "بادل چھائے ہوئے ہیں، بس ہونے ہی والی ہے۔"

میں نے اپنے آپ سے پوچھا "ہم اتنی شد و مد سے برفباری کا انتظار

کیوں کر رہے ہیں؟" اور میں نے جواب دیا "شاید اس لیے کہ ہم منافق نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ظاہر باطن ایک ہو!"

حفیظ صاحب

ابوالاثر حفیظ جالندھری کو مَیں نے پہلی مرتبہ آج سے قریباً بیس برس قبل ماڈل ٹاؤن میں واقع ان کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں دیکھا تھا۔ میری عمر اس وقت سترہ برس تھی اور حفیظ صاحب کی عمر اُس وقت بھی شاید اتنی ہی تھی کیونکہ اس وقت بھی ان کی صحت اور باتیں ہو بہو آج جیسی تھیں۔ وہ بالائی منزل پر ڈرائنگ روم کے قالین پر صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور انہوں نے جسم پر ایک سفید چادر اس طرح اوڑھی ہوئی تھی جس طرح احرام باندھا ہو۔ برابر والے صوفے پر ایک صاحب بیٹھے ان سے باتیں کر رہے تھے اور باتیں کرتے کرتے وہ بار بار زمین پر ان کے برابر بیٹھنے کے لیے اپنی جگہ سے سرکتے مگر حفیظ صاحب ان کی کلائی پکڑ لیتے

مَیں اور میرا ایک دوست حفیظ صاحب کو اس مشاعرے میں مدعو کرنا چاہتے تھے جو ماڈل ٹاؤن ہی میں ہماری قائم کردہ ادبی انجمن کے زیرِ اہتمام منعقد ہو رہا تھا اور جس میں شعراء کے لیے ڈنر کا انتظام ہماری ادبی انجمن کے سرپرست پیر موتیاں والا نے اپنے ذمے لے لیا تھا اور اس کے علاوہ دیگر اخراجات کے لیے مبلغ چھتیس روپے آٹھ آنے کی خطیر رقم ہم دوستوں نے اپنے جیب خرچ سے بچا کر جمع کر رکھی تھی جو ماڈل ٹاؤن کے ایک بینک میں جمع تھی اور جو انجمن کے صدر اور سیکرٹری کے مشترکہ دستخطوں ہی سے "ڈرا" کی جا سکتی تھی۔ مَیں اور میرا دوست ابوالاثر کے پاس

مؤدب ہو کر قالین پر بیٹھ گئے۔ حفیظ صاحب نے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا لیکن ہمارے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ شاہنامۂ اسلام کا مصنف، ترانۂ پاکستان کا خالق، خوبصورت غزلوں اور گیتوں کا خالق زمین پر بیٹھا ہو اور ہم صوفے پر براجمان ہو جائیں؛ چنانچہ ہم قالین پر بیٹھے بہت عقیدت اور انہماک سے حفیظ صاحب کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے اور ان کی گفتگو سنتے رہے۔ ہمارے لیے یہ ملاقات ایک خواب کی سی کیفیت رکھتی تھی کہ ہماری نظروں کے سامنے اس وقت وہ شخصیت تھی جس نے بجا طور پر کہا تھا:

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے
نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

بہرحال جب وہ گفتگو سے فارغ ہوئے تو انہوں نے ہماری طرف توجّہ کی اور شفقت سے پوچھا "کیسے آئے ہو؟" ہم نے مدّعا عرض کیا، انجمن کی مالی حالت بھی گوش گزار کی اور اپنے ذوق و شوق کا حوالہ بھی دیا تاکہ کسی طور ان کا دِل پسیجے اور وہ ہمارے مشاعرے میں چلے آئیں۔ حفیظ صاحب نے یہ سب کچھ سنا اور پھر کہا "مجھے تم نوجوانوں سے بڑی محبت ہے۔ تم قوم کا سرمایہ ہو۔ مجھے تم سے بڑی توقعات ہیں لیکن بیٹے میں اس روز راولپنڈی میں ہوں گا۔" ہم نے ہمّت کر کے تھوڑا سا اصرار کیا، لیکن جب بالکل مایوس ہو گئے تو ان سے اجازت چاہی، اس پر حفیظ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا "نہیں ــــ میں تمہیں خود سیڑھیوں تک چھوڑ کر آؤں گا۔ مجھے تم نوجوانوں سے بڑی محبت ہے، تم قوم کا سرمایہ ہو" اور پھر وہ ہمیں سیڑھیوں تک چھوڑنے آئے اور سیڑھیاں اُترتے ہوئے بھی ان کے یہ کلمات ہمارے کانوں میں رس گھولتے رہے کہ

"تم قوم کا سرمایہ ہو، مجھے تم سے بڑی توقعات ہیں۔"

اور پھر وہی ہوا جو کہ شفیق الرحمٰن نے ایک جگہ لکھا ہے اور شفیق الرحمٰن نے

لکھا یہ ہے کہ پاکستانی بچے بڑے اچھے ہوتے ہیں، مگر افسوس کہ بڑے ہو جاتے ہیں؛ چنانچہ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ میں بھی بڑا ہو گیا یعنی سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی کی دیواریں پھلانگتا ہوا روزنامہ 'نوائے وقت' سے وابستہ ہو گیا۔ اس دوران میں نے حفیظ صاحب کو متعدد مشاعروں میں سنا، بلکہ بہت سے مشاعروں میں ان کے ساتھ پڑھنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ نجی محفلوں میں بھی ان سے ملاقات ہوئی اور کئی بار میں حفیظ صاحب کو ان کی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں بھی ملا اور بقولِ ندیم ہر بار

مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

ایسی کیفیت سے دوچار ہوا۔ مثلاً مشاعروں میں مَیں نے یہ دیکھا کہ حفیظ صاحب ہوٹ ہونا نہیں جانتے۔ سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شعر پڑھتے ہیں اور فقرے کا جواب اتنے کٹیلے فقرے سے دیتے ہیں کہ ہوٹنگ کرنے والا صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ شاید یہ اسی خود اعتمادی کا اثر ہے کہ ابوالاثر کو پُرامن مشاعرے اچھے نہیں لگتے، چنانچہ جس مشاعرے میں ہوٹنگ کا معقول انتظام نہ ہو، حفیظ صاحب اس کا اہتمام خود فرماتے ہیں۔ عام ملاقاتوں میں حفیظ صاحب کو اتنا مہربان پایا کہ ایک طرح سے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنے مخاطب کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں اور دوبارہ پکڑنے کے لیے درمیان میں کچھ دیر کے لیے چھوڑ بھی دیتے ہیں کلائی پر ان کی گرفت اتنی ہی مضبوط ہوتی ہے، جتنی ان کی شعر پر ہے۔ اگر حفیظ صاحب خود پردے کے پیچھے چھپ جائیں اور کسی نازنین کی کلائی پکڑ لیں تو مجھے یقین ہے کہ اسے چھڑانے کی خواہش نہیں ہو گی —— ! اور جب کبھی مجھے حفیظ صاحب کے گھر جانے کا اتفاق ہوا ہے، مجھے ان کے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چائے پینے کو ملی ہے۔ یہ صورتِ حال چند برس پہلے تک تھی اور خدا جانے اب ہے یا نہیں کہ حفیظ صاحب

نے اتنی بڑی کوٹھی میں سے خود کو صرف ایک کمرے تک محدود رکھا ہوا ہے۔ اس کمرے میں ایک سگھڑ خانہ دار کی طرح فوری ضرورت کی سبھی چیزیں موجود ہیں۔ ایک طرف کتابوں اور حفیظ صاحب کے غیر مطبوعہ مسوّدوں کا ڈھیر بھی لگا ہوا ہے۔ اور اسی کمرے میں تیل سے جلنے والا اسٹوو، دیگچی، کپ، دودھ اور چینی بھی موجود ہیں۔ حفیظ صاحب صاحب خود چائے بناتے ہیں۔ خود پئیں نہ پئیں، مہمان کو ضرور پلاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ٹرین میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے بڑی نفاست سے کھیرا کاٹا اور اس کی قاشیں بنا بنا کر اپنے سامنے والی سیٹ کے مسافر کو پیش کرتے رہے۔ جب انہوں نے تیسری یا چوتھی قاش اس مسافر کو پیش کی تو اس نے کہا:
"صاحب آپ خود بھی تو کھائیے"۔ اس پر میزبان نے کہا "چھڈّو جی، اے وی کوئی بندیاں دے کھان والی چیز اے!" خیر حفیظ اپنے مہمان کو اس قسم کی بات نہیں کہتے، چنانچہ اپنی بنائی ہوئی چائے کبھی کبھی خود بھی پی لیتے ہیں!

لیکن حفیظ صاحب کی شخصیت کے یہ اور اس کے علاوہ بہت سے رخ دیکھنے کے باوجود میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو بیس سال پیچھے چلا جاتا ہوں اور خود کو ان کے سامنے مؤدب بیٹھا پاتا ہوں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا دبدبہ دل پر آج بھی قائم و دائم ہے۔ انہوں نے اس بیس برس کے عرصے میں بیسیوں بار ازراہِ شفقت میرے لیے توصیفی کلمے کہے ہیں، لیکن میری اگر کوئی خواہش ہے تو وہ صرف اس قدر کہ میں انہیں ایک بار پھر کسی مشاعرے میں مدعو کرنے جاؤں، جواب میں حفیظ صاحب بے شک معذرت کر دیں، اگر یہ ضرور کہیں کہ تم نوجوان ہو، قوم کا قیمتی سرمایہ ہو، بلکہ یہ "قوم کا قیمتی سرمایہ" والی بات بھی بے شک نہ کہیں صرف یہی کہہ دیں کہ "تم نوجوان ہو" تو میں ان کے پاؤں چھو لوں کہ بہت سارے لوگ تو دوسری شادی، نکاح کے بعد دولہا

کے زنان خانے کی طرف جانے کے دوران بولے جانے والا یہ جملہ سننے کے لیے
کرتے ہیں کہ "کڑیو! رستہ دیو، منڈا آ ریا جے!"

قاسمی اور قاسمی

ایک خرگوش نے پہلی بار ہاتھی کو دیکھا تو اس پہاڑ ایسی مخلوق کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں ملیں اور پھر پوچھا "تم کون ہو؟" ہاتھی نے جواب دیا: "مَیں ہاتھی ہوں" خرگوش نے ایک بار پھر اس کے قدوقامت پر نظر ڈالی اور حیران ہو کر پوچھا "تمہاری عمر کتنی ہے؟" ہاتھی نے کہا: "چھ ماہ" خرگوش خاموش ہو گیا۔ ہاتھی نے اسے یوں چُپ ہوتے دیکھا تو پوچھا "تمہاری عمر کتنی ہے؟" اس بار خرگوش نے اپنے جسم کو ٹٹولا اور پھر جھینپتے ہوئے کہا "عمر تو میری بھی چھ ماہ ہی ہے مگر پچھلے دنوں ذرا بیمار شمار رہا ہوں"

سو معاملہ یہ ہے کہ احمد ندیم بھی قاسمی ہیں اور مَیں بھی قاسمی ہوں۔ اور یہ جو ہم دونوں کے ادبی قدوقامت میں کچھ تھوڑا بہت فرق نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ پچھلے دنوں میں بھی ذرا بیمار شمار رہا ہوں۔ دراصل اس نوع کی وضاحت کی ضرورت یُوں محسوس ہوتی ہے کہ آج کل دوسروں کی بڑائی کا کھلے بندوں اعتراف کرنے کا کچھ زیادہ رواج نہیں رہا، چنانچہ یار لوگ کسی بڑی شخصیت کو یا تو اپنے ہی جیسا کوتاہ قامت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یا پھر خود اونچی ایڑی کے جُوتے پہننے لگتے ہیں خواہ ایسا کرنے سے پاؤں میں موچ ہی کیوں نہ آ جائے۔ مَیں بھی انہی "یار لوگوں" میں سے ہوں اور یوں میرے لیے بھی اس

انسان کی بڑائی کے اعتراف میں خاصی دشواری پیش آرہی ہے جو اپنے حریفوں تک کی عظمت کے اعتراف سے باز نہیں آتا، بلکہ پیروں کے خانوادے کا فرد ہونے کی حیثیت سے تو انہیں کئی بار نیم جاں لوگوں پر بھی دم درود کرتے پایا گیا ہے، جبکہ سائیں منیر نیازی کا کہنا ہے کہ مُردوں کو زندہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ حضرت عیسیٰؑ جن مُردوں کو زندہ کرتے تھے، بعد میں وہی ان کے بیری ہو جاتے تھے۔ مثلاً فہمیدہ ریاض نے ایک جگہ لکھا ہے کہ: "اگر احمد ندیم قاسمی نے ابتدا میں ان کی بھرپور طور پر حوصلہ افزائی نہ کی ہوتی تو وہ کبھی شاعرہ نہ بن پاتیں ـــــ" اور جب وہ شاعرہ بن گئیں تو انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ بات کہی کہ احمد ندیم قاسمی ایک شریف آدمی ہیں اور شریف آدمی کبھی عظیم فنکار نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں صرف دو باتیں کہنے کو جی چاہتا ہے۔ پہلی بات تو قاسمی صاحب سے کہنے کی ہے کہ "قاسمی صاحب! ہور چُوپو" اور دوسری بات متذکرہ بیان کی تصدیق کے سلسلے میں ہے، کیونکہ مَیں خود ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایک شریف آدمی عظیم فنکار نہیں ہو سکتا۔ عظیم فن کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم لبتہ ب کا بدمعاش ہو اور وہ جیل میں یوں جائے جس طرح لوگ سسرال جاتے ہیں۔ اس میں سے قاسمی صاحب فی الحال صرف جیل جانے والی شرط ہی پوری کر پاتے ہیں۔ گو ان کا جیل جانا اس جُرم کی پاداش میں تھا کہ ان کی نشست ظالموں کے بجائے مظلوموں کی صف میں کیوں ہے؟ تاہم بہتر ہو گا اگر قاسمی صاحب ان دنوں جب انارکلی میں واقع "فنون" کے دفتر سے نکلیں تو پبلک کے پُرزور اصرار پر کسی راہ چلتی دوشیزہ کو اٹھانے کے لیے بھرے بازار میں خنجر لہرانے کا مظاہرہ بھی کر ہی ڈالیں اور مزید بہتر ہو گا کہ اگر لڑائی مارکٹائی سے بھرپور اس شاہکار کا شاندار افتتاح

جمعۃ المبارک کو کیا جائے تاکہ ان کی عظمت کے کھڑکی توڑ ہفتوں کا سلسلہ شروع ہو سکے۔

قاسمی صاحب سے متذکرہ فرمائش سے قطع نظر جو بات آپ کو بتانے کی ہے وہ یہ ہے کہ قاسمی صاحب اپنے کھچڑی بالوں کے باعث جتنے بزرگ نظر آتے ہیں اتنے ہیں نہیں ــــ آپ انہیں قریب سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ان میں نوعمر جوانوں ایسا حسن پایا جاتا ہے ، بلکہ ان میں بچپن کی معصومیت بھی ابھی تک تروتازہ ہے۔ بس اتنا ہے کہ جہاں بزرگ بننا ہوتا ہے بزرگ بن جاتے ہیں، جہاں جوان بننا ہوتا ہے جوانوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے اپنا بچپن واپس لے آتے ہیں ــــ مثلاً کسی دور دراز شہر میں مشاعرہ ہے اور ہم پانچ چھ "مبینہ" نوجوان بھی وہاں مدعو ہیں ؛ چنانچہ سٹیشن پر پہنچ کر جب ٹکٹیں لینے کا موقع آتا ہے تو اس وقت قاسمی صاحب فوراً بزرگ بن بیٹھتے ہیں اور روکنے کے باوجود ٹکٹیں خریدنے کے لیے کھڑکی تک پہنچ جاتے ہیں۔ ٹرین میں سفر کے دوران لطیفوں کا دور شروع ہوتا ہے تو ایسے "مقوی" لطیفے سناتے ہیں کہ "مایوس نوجوان" بھی اپنے اندر زندگی کی نئی لہر محسوس کرنے لگتے ہیں اور جب وقت گزاری کے لیے تاش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو قاسمی صاحب وہ "رونڈیاں" مارتے ہیں کہ اپنا بچپن نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ان کی یہ معصومانہ حرکتیں مقام مشاعرہ پر پہنچ کر بھی جاری رہتی ہیں ؛ چنانچہ مشاعرے کے اختتام پر وہاں رہائش کے لیے مختص کمرے میں کپڑے تبدیل کرتے وقت وہ ہمیں دکھائی نہ دینے والے "ڈولے" پہلوانوں کے انداز میں دکھاتے ہیں اور بچوں کی طرح معصوم ہنسی ہنستے ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اگر انہیں کبھی ہم بھولے سے کہہ دیں کہ آپ ہمارے بزرگ

ہیں تو وہ ہاتھ نچا کر کہتے ہیں "بزرگ ہو گے تم، بزرگ ہوں گے تمہارے بزرگ" اور وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ان کی بزرگی ہم جوانوں کے لیے قابلِ رشک ہے۔ وہ روزانہ صبح آٹھ بجے پکی ٹھٹھی میں واقع اپنے مکان سے پتلون کے دونوں پائنچے اوپر اُٹھائے نکلتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ پکی ٹھٹھی کی تمام سڑکیں کچی ہیں۔ اور اگر کوئی گزرنے والا ایک گھوڑا بھی ادھر سے گزر جائے تو وہاں مہینوں پانی جمع رہتا ہے۔ قاسمی صاحب چوک میں پہنچ کر تانگے کا انتظار کرتے ہیں اور پھر اس تانگے میں چوبرجی پہنچ کر مجلس ترقی ادب کے دفتر پہنچنے کے لیے رکشہ کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔ پھر نو بجے سے دو بجے تک وہاں کام کرتے ہیں۔ ڈھائی تین بجے "فنون" کے دفتر پہنچتے ہیں اور وہاں ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھتے ہیں۔ وہاں سے اُٹھ کر نیلے گنبد کے چوک میں ایک معقول عرصہ رکشے کا انتظار کرنے کے بعد جب شام کو گھر پہنچتے ہیں تو ایک بار پھر لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں جس میں نظمیں، غزلیں، افسانے، ڈرامے اور تنقید نگاری کے علاوہ اخبار کا ڈیلی کالم بھی شامل ہے اور یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ ان سب کاموں کے ساتھ ساتھ وہ ایسے مشاعروں کی صدارت بھی کرتے ہیں جو بسا اوقات رات کے نو بجے شروع ہو کر صبح چار بجے محض اس لیے اختتام پذیر ہو جاتے ہیں کہ کوئی ادب دشمن قریبی تھانے میں امن عامہ میں خلل کی رپٹ درج کرا دیتا ہے۔ گھریلو ذمہ داریاں نبھانا اور احباب سے میل ملاقات اس کے علاوہ ہے۔ مزید اگر تحصیل خوشاب میں اپنے قریبی یا دُور کے عزیزوں کے غم اور خوشی میں شرکت کرنے کے لیے بگ اور لاچا پہنے آٹھ دس گھنٹے لاری کے "پاسے توڑ" ہچکولے کھانا بھی ان کا روز کا معمول بن چکا ہے۔ یہ سلسلہ غالباً اس لیے چل رہا ہے کہ وہ خود پر کبھی وہ بزرگی طاری نہیں ہونے دیتے جو نوجوانوں کو بھی لپے ہوئے کریلے جیسا بنا کر رکھ دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ ان کی یہ دلکش اور دلربا شخصیت ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ وہ ایک نظریاتی فنکار ہیں جن کی تخلیقات میں نظریہ اور فن اِک مِک ہو کر سامنے آتے ہیں۔ انہیں پڑھتے ہوئے ذہن کو آسودگی بھی ملتی ہے اور سوچ کے دروازے بھی وَا ہوتے ہیں۔ وہ مالشیے شاعر یا افسانہ نگار نہیں ہیں کہ اپنے قاری کو محض چند لمحوں کی آسودگی بخشیں اور پھر تیل کی شیشی جیب میں ڈال کر گھر کو ہولیں۔ وہ اقبال کے سلسلے کی ایک انتہائی اہم کڑی ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اقبال کے بعد وہ برصغیر پاک و ہند کے سب سے بڑے نظریاتی شاعر ہیں۔ ان کی "کومیٹ منٹ" (COMMITMENT) پہلے دن سے عوام کے ساتھ ہے اور اس ضمن میں انہوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ خالد احمد کا کہنا ہے کہ 'ترقی پسندی' مقصد دوستی' عوام دوستی اور وطن دوستی کی تثلیث سے وجود میں آتی ہے۔ اس کی یہ بات یقیناً درست ہے' مگر میں اس میں ایک رُشق انسان دوستی کا اضافہ بھی کرنا چاہتا ہوں' کیونکہ میرے نزدیک ترقی پسندی کی مکمل اور عملی صورت احمد ندیم قاسمی کی صورت میں اُبھرتی ہے اور ندیم صاحب جہاں وطن دوست ہیں' عوام دوست ہیں اور مقصد دوست ہیں وہاں ان کی نظم اور نثر میں دنیا کے سبھی خطّوں کے انسانوں کے لیے ایک غیر مشروط محبت بھی جھلکتی ہے' کیونکہ وہ انسانوں کو بُنیادی طور پر ایک قابلِ محبت مخلوق تصوّر کرتے ہیں۔

اور ہاں اس ذکر سے یاد آیا کہ میری عمر اس وقت چونتیس برس ہے' چنانچہ بالغ ہونے کے بعد سے اب تک محبت کے ضمن میں میرا تیس سالہ تجربہ یہ ہے کہ محبت کرنا آسان ہے محبت کی اداکاری مشکل ہے۔ مَیں نے احمد ندیم قاسمی

کو افسانوں اور شعروں کے علاوہ عام زندگی میں بھی لوگوں سے محبت کرتے دیکھا تو یہ تڑہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کہیں محبت کے بجائے محبت کی اداکاری تو نہیں کرتے ؟ جیسا کہ میں نے ابھی کہا محبت کرنا آسان اور محبت کی اداکاری مشکل ہے، کیونکہ محبت میں انسان پہاڑوں کا سینہ چیر دیتا ہے اور اسے یہ کام تلمی آم کاٹنے کے برابر محسوس ہوتا ہے اور میں نے دیکھا کہ ندیم صاحب محبت کرتے ہیں اور یہ ان کی مجبوری ہے، کیونکہ ان کی مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ وہ اداکاری نہیں کر سکتے۔ میں اس فیصلے پر ایک دن میں نہیں پہنچا، بلکہ پے در پے مشاہدات نے میری انگلی پکڑ کر مجھے اس نتیجے پر پہنچا دیا۔ باقی باتیں چھوڑیں۔ میں نے ندیم صاحب کی محبت کا ایک رُخ اور بھی دیکھا ہے۔ ان کی اس محبت کا ہدف وہ نئے لکھنے والے بنتے ہیں جن کے تخلیقی جوہر کے ضمن میں ندیم صاحب کو کوئی شبہ نہیں۔ میں نے یہاں ہدف کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ ندیم صاحب لٹھ لے کر ان کے "دوالے" ہو جاتے ہیں اور ان سے ہر ماہ "بنوکِ شمشیر" کچھ نہ کچھ لکھوا لیتے ہیں۔ اس واقعہ کی سنگینی کا مزید اندازہ آپ کو اس صورت میں ہو سکتا ہے اگر آپ کو کسی رسالے کے ایڈیٹر بلکہ ایک بڑے رسالے کے بڑے ایڈیٹر کی انا کا اندازہ ہو اور اس واقعہ کی لذّت سے آپ اس صورت میں ہمکنار ہو سکتے ہیں جب یہ ایڈیٹر نہ صرف یہ کہ بقلم خود آپ سے اپنے پرچے کے لیے کوئی چیز مانگے، بلکہ دس آدمیوں کی موجودگی میں کچھ اس انداز سے طلب کرے کہ آپ کی اپنی انا پھول کر غبارہ بن جائے، تو معاملہ یہ ہے کہ ندیم صاحب نوجوانوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں، بلکہ کئی بار تو ایسا ہوا ہے کہ "فنون" کی کاپیاں پریس جانے کے لیے تیار پڑی ہیں، مگر پریس اس لیے نہیں بھجوائی جا رہیں کہ ایک نوجوان کی تازہ تخلیق کا انتظار ہے وہ اپنی مصروفیات

کی بنا پر بصد ادب معذرت کرتا ہے تو ندیم صاحب کہتے ہیں "آپ کو جب فرصت ہو لکھ بھیجیے۔ "فنون" بہرحال اتنی دیر تک شائع نہ ہوگا۔ ظاہر ہے اس جواب پر اسے نثری کشری ہڈ حرامی چھوڑنا ہی پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر سال نوجوان تخلیق کاروں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوتی ہے جو آگے چل کر اُردو ادب کی آبرو ثابت ہوتی ہے۔

یہ محبت خاصی گنجلک اور پیچیدہ چیز ہے۔ کبھی تو سمٹ کر ایک نقطے پر مرتکز ہو جاتی ہے اور کبھی پھیل کر کائنات کی وسعتوں پر حاوی ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ندیم صاحب کی محبت خاصی "توسیع پسندانہ" ہے۔ وہ اپنے دوستوں اور پیاروں سے محبت کرتے کرتے اس ملک کے کروڑوں بھوکے ننگے عوام سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ جب انہیں اس کے باوجود سیری نہیں ہوتی، تو دنیا بھر کے پسے ہوئے طبقوں پر اپنی محبت کا سایہ کر دیتے ہیں ـــــ ندیم وہ بلند و بالا مینار ہے جہاں سے محبت کی اذان بلند ہوتی ہے اور دکھی دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔

لیکن مَیں نے تو ندیم صاحب کو کئی مواقع پر محبت چھوڑ مروّت سے بھی دستبردار ہوتے دیکھا ہے اور خاصا حیران ہوا ہوں۔ مثالیں تو اور بھی بہت سی ہیں، لیکن مجھے ایک حالیہ واقعہ یاد آ گیا ہے۔ پہلے وہ بیان کر لوں۔ گزشتہ دنوں ادیبوں کا ایک وفد "روس یاترا" کے لیے ترتیب دیا گیا جس کے لیڈر سندھ کے ایک شاعر تھے جو قومی حلقوں میں خاصے متنازعہ ہیں ـــــ ندیم صاحب کو بھی اس وفد میں شمولیت کی دعوت دی گئی، مگر ندیم صاحب نے انکار کر دیا۔ وجہ اس کی انہوں نے یہ بیان کی کہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے مجھے ان کے نظریات سے اختلاف ہے؛ چنانچہ وفد کے سربراہ کی حیثیت سے وہ روس میں جو کچھ کہیں گے، اگر میں وہاں اس

کی تردید کرتا ہوں تو یہ ضوابط کی خلاف ورزی ہو گی اور اگر میں خاموش رہوں تو اپنے نظریات کے ساتھ غداری کروں گا۔ ندیم صاحب کی اس حرکت پر میں خاصا حیران ہوا تھا، کیونکہ ایک تو وہ یہاں اپنی محبت کے رویّے سے دستکش ہو گئے تھے اور دوسرے انہوں نے بیٹھے بٹھائے روس کی مفت سیر کا زریں موقع گنوا دیا، حالانکہ ہمارے ہاں اگر کسی کو غیر ملکی دورے کی پیشکش کی جائے اور اس کے ساتھ یہ شرط عاید کی جائے کہ اسے ایک گھنٹے تک بکری بن کر کان پکڑنا ہوں گے تو وہ ہنسی خوشی یہ شرط قبول کر لے گا، بلکہ ہم نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ دانشور اگرچہ مقررہ مدت کے بعد کان چھوڑ دیتا ہے، مگر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بکری ہو جاتا ہے۔

لیکن ندیم صاحب ایسی ترغیبات سے ایک دفعہ نہیں گزرے بے شمار دفعہ گزرے ہیں اور ایسے مواقع پر انہوں نے محبت سے اعلانِ لاتعلقی کر کے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں۔ ایسا ہی ایک موقع اس وقت بھی آیا تھا جب ایک بھارتی ادیب جن کی تمام عمر پاکستان دشمنی میں بسر ہوئی تھی اور جن کے ندیم صاحب کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے، فوت ہوئے۔ مجھے یاد ہے "فنون" میں ان کے بارے میں جو کچھ چھپا، وہ پڑھ کر میں ایک بار پھر حیران ہوا تھا، لیکن اس کے بعد میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا۔ میں نے یہ جان لیا کہ ندیم کا عہدِ وفا مظلوموں سے ہے ظالموں سے نہیں۔

ندیم صاحب کو میں نے وزرا اور حکام کے ساتھ بھی بڑا عجیب طرزِ عمل اختیار کرتے دیکھا ہے۔ کئی تقریبات میں ایسے ہوا ہے کہ ایک سے ایک بڑا دانشور محفل میں موجود وزیر صاحب کے ہاتھ چومنے کے لیے بیتاب نظر آ رہا ہے، لیکن ندیم صاحب اس کی طرف "کنڈ" کیے بیٹھے ہیں، حتّٰی کہ میں نے دیکھا

کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر خود ان کے پاس آیا ہے اور بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا ہے اور پھر ان کے برابر میں بیٹھ گیا ہے۔ ندیم صاحب کے چہرے پر ان کی دل موہ لینے والی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ وہ پوچھتے ہیں "کیا حال ہے؟" اور اس ایک جملے کے بعد اس کی طرف سے یکسر غافل ہو کر قریب بیٹھے ہوئے کسی ٹھٹ ٹٹ ادیب سے مصروفِ گفتگو ہو جاتے ہیں۔ یہ منظر میں نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ دیکھا ہے اور ہر بار دل میں کہا ہے کہ "ہدایت اللہ! تُیں ترقی نہیں کر سکدا"۔ سو میری عمر اس وقت چونتیس برس ہے اور محبّت کے ضمن میں میرا تیس سالہ تجربہ یہ ہے کہ محبّت کرنا آسان ہے۔ محبت کی اداکاری مشکل ہے۔ وزیروں کی طرف "کنڈ" کر کے بیٹھنے والے ندیم صاحب بہت مصروف آدمی ہیں ان کے پاس واقعی اداکاری کے لیے وقت نہیں ہے۔

اور جہاں تک اداکاری کا تعلق ہے، میں نے جاگیردار شاعروں کو شاعرِ انقلاب کہلاتے، بیوروکریٹ شاعروں کو عوام کی باتیں کرتے اور مزدوروں، کسانوں کی حالتِ زار پر ٹسوے بہاتے دیکھا ہے۔ اور کچھ نہیں دیکھا تو وہ خلوص ہے جو ان کے عمل میں نظر آنا چاہیے تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے ندیم کو صرف پڑھا ہی نہیں، قریب سے دیکھا بھی ہے، ورنہ میں انہیں بھی اس گروہ میں شامل سمجھتا جو رات کو غرقِ مئے ناب ہوتے ہیں اور دن کو مزدوروں کے غم میں غلطاں نظر آتے ہیں۔ میں نے اگر کچھ دیکھا تو یہ کہ ندیم صاحب کے پاس ایک مفلوک الحال ادیب آتا ہے اور انہیں مفلوک الحال کر کے چلا جاتا ہے۔ پھر اگلے روز وہ ٹی ہاؤس میں بیٹھا انہیں گالیاں دے رہا ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ندیم صاحب کے احباب اور نیازمندوں میں بڑے بڑے وزیر سفیر بھی شامل ہیں، مگر ندیم صاحب

انہیں کبھی اس گرمجوشی سے نہیں ملے جس گرمجوشی سے وہ ان لکھاری دوستوں کو ملتے ہیں
جن سے انہیں "فیض" کے لیے نظموں غزلوں اور افسانوں کے انبار کے سوا کچھ حاصل
نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ ہم لوگوں نے برِصغیر کی اس عظیم ادبی شخصیت
کے ساتھ اسٹیشن کے ٹی سٹال پر کھڑے ہو کر بیس پیسے کپ والی چائے پی ہے۔
ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک غلیظ ہوٹل میں تنگ دامانی کے شکار بنچ کے
کونے پر بیٹھ کر انہوں نے ہمارے ساتھ سموسے بھی کھائے ہیں۔ لوگوں نے انہیں
مزدوروں کے جلوس میں "حلق شگاف" نعرے لگاتے بھی دیکھا ہے اور تحریکِ پاکستان
میں عوام کے ہجوم کے مابین انہیں نظمیں سناتے بلکہ گاتے بھی پایا گیا ہے۔ عوام کے
ساتھ ان کا اتنا گہرا رابطہ دیکھ کر ہی مجھے یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ خود کو "سکّہ بند"
انقلابی کہلانے پر ضد کیوں نہیں کرتے۔ شاید اس لیے کہ ان میں سے بیشتر کا منہ
"سکوں" سے بالآخر "بند" ہو جاتا ہے اور پھر عوام کے ساتھ ان کا وہی تعلق باقی رہ جاتا ہے
جسے عرفِ عام میں ناجائز تعلق کہا جاتا ہے۔

میں باتوں باتوں میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ احمد ندیم قاسمی اور مجھ میں
نسبی لحاظ سے صرف "قاسمی" ہونا ہی مشترک نہیں، بلکہ اس کے علاوہ یہ کہ وہ بھی پیرزادے
ہیں اور میں بھی پیرزادہ ہوں۔ وہ بھی علما کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور میں بھی
علما کے خاندان کا آخری چشم و چراغ ہوں۔ میر تقی میر نے کہا تھا ؎

اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
مشکل ہے بڑی آن کے صاحب نظروں کو

اور اس میں کیا شبہ ہے کہ "قاسمیوں" میں ایک قدرِ مشترک "صاحب نظر" ہونا بھی
ہے خواہ وہ احمد ندیم قاسمی ہوں یا عطاء الحق قاسمی؛ چنانچہ اس باغ کے ہر گُل سے

ان قاسمی حضرات کی آنکھیں چپک کر رہ جاتی ہیں؛ تاہم احمد ندیم قاسمی کا کمال یہ ہے کہ ایسے مواقع پر انہوں نے کبھی خود کو مشکل میں محسوس نہیں کیا یا پھر یہ کہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس ضمن میں تو ایک واقعہ کا عینی شاہد بھی ہوں۔ قاسمی صاحب ایک روز رکشہ نہ ملنے کی صورت میں میرے ساتھ سکوٹر پر بیٹھے تھے اور میں اس روز حفاظتی اقدامات کے تحت اس باغ کے ہر "گل" سے نظریں بچاتا ہوا سیدھا تک دیکھ رہا تھا کہ اچانک قاسمی صاحب گفتگو کرتے کرتے خاموش ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد انہوں نے دھیمی دھیمی سی آواز میں "سبحان اللہ" کہا۔ میں نے اس پر حیران ہو کر دائیں بائیں نظر دوڑائی تو ارد گرد سوائے انتہائی خوبصورت چہرے کے اور کوئی چیز "سبحان اللہ آور" نہیں تھی۔ بس قاسمی صاحب کی ساری رنگین مزاجی خوبصورت چہروں کو دیکھ کر اس ایک "سبحان اللہ" تک ہی محدود ہے؛ چنانچہ بڑے قاسمی اور چھوٹے قاسمی میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ یہ کہ ایسے مواقع پر وہ محض "سبحان اللہ" کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں، جبکہ میں "انشاءاللہ" بھی کہتا ہوں، شاید اس لیے کہ میں نے زندگی میں عظیم فنکار بننے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

مخولیا

امجد اسلام امجد کے بارے میں یہ سطور لکھتے ہوئے مجھے حد درجہ دشواری پیش آ رہی ہے۔ میں اب تک دو دو چار چار سطریں لکھ کر کتنے ہی کاغذ پھاڑ چکا ہوں مگر اسپ خیال رواں نہیں ہوا۔ پہلے میں نے سوچا کہ امجد کے سنائے ہوئے لطیفوں میں سے کوئی لطیفہ درج کر کے گفتگو کا آغاز کروں، مگر ذہن پر سخت زور دینے کے باوجود مجھے کوئی ایسا لطیفہ یاد نہ آیا کہ جس کے سنانے پر حد جاری نہ ہو سکتی ہو۔ پھر میں نے سوچا کہ امجد کے سر سے بات شروع کرتا ہوں! چنانچہ میں نے پہلا فقرہ لکھ بھی لیا کہ اس کا سر دیکھ کر دھیان سر سے زیادہ سابر یا کی طرف جاتا ہے، مگر میں نے یہ ورق بھی پھاڑ دیا، کیونکہ اس طرح کی سفلی باتیں تو وہ سنتا ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ لوگوں کو اس ہینڈسم شخص کی بے پناہ ظرافت اور فنِ جملہ بازی میں اس کی مہارت کے ضمن میں کچھ واقعات سناؤں، مگر میں نے یہ آئیڈیا بھی یہ سوچ کر ڈراپ کر دیا کہ جو اسے مل چکے ہیں انہیں پتہ ہی ہے اور جو آئندہ ملیں گے انہیں لگ پتہ جائے گا! ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ اس بار اس کی شخصیت پر کچھ لکھنے کے بجائے اس کے فن پر کوئی بھاری بھر کم قسم کا مقالہ لکھ ڈالوں، مگر اس قبیل کے دو چار فقرے لکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ بارِ امانت کاغذ نہیں اٹھا سکتا۔ صرف وہ انسان اٹھا سکتا ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ بے شک خسارے میں ہے!

چنانچہ میں تھک ہار کر بیٹھ گیا ہوں اور اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شخص مذکور کے بارے میں کیا لکھوں!

لیکن وہ جو بچپن میں میں نے اور آپ نے "ٹرائی ٹرائی اگین" والی کہانی پڑھی تھی۔ مجھے اس وقت وہ یاد آرہی ہے اور صرف یاد نہیں آرہی بلکہ کچھ نئے رستے بھی سجھا رہی ہے۔ مثلاً میرے جی میں آتی ہے کہ میں بھی خاکہ نگاری کی "دہی" تکنیک استعمال کروں جس میں خاکہ نگار اپنے ممدوح بلکہ ممدوحہ تک کی ماں بہن ایک کر دیتا ہے اور اس گالی گلوچ کے ملبے میں سے ممدوح کی عظمت سر باہر نکال نکال کر قاری کو آنکھیں مارتی ہے، چنانچہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے امجد کی کمینگیاں یاد کرنے کی کوشش کی، مگر اس ضمن میں میرا حافظہ جواب دے گیا ہے۔ مجھے اگر کچھ یاد ہے تو یہ کہ وہ کمینگی کرنے کا "اہل" ہی نہیں ہے۔ اس کے طالب علمی کے زمانے کے دو تین دوستوں نے متعدد مواقع پر کمین گاہ سے اس کی طرف تیر پھینکے ہیں مگر یہ انہیں دیکھ کر ہر بار مسکرا کر رہ گیا ہے، البتہ یہ مسکراہٹ اس طرح کی ہوتی ہے جیسے کہہ رہی ہو "لے تینوں میرا صبر پوے" تو گویا ثابت ہوا کہ امجد کی برائی کا ڈنکا بجانا بھی میرے لیے ممکن نہیں، کیونکہ مجھے اس کی کوئی کمینگی یاد نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ امجد نہ سگریٹ پیتا ہے نہ شراب پیتا ہے اور نہ وہ کام کرتا ہے جس کے کرنے یا نہ کرنے کی صورت میں پریشانی یا پشیمانی اٹھانا پڑتی ہے۔ اگر میں اس ضمن میں زیادہ ایمانداری سے بات کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ اس نے زندگی میں کبھی چوری نہیں کی، بس زیادہ سے زیادہ چھوٹی موٹی ہیرا پھیری کی ہے اور اس چھوٹی موٹی ہیرا پھیری کے سہارے میں اس کے ارد گرد عظمت کے تانے بانے کس طرح بُن سکتا ہوں۔

اور میں تھک ہار کر بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے امجد کے بارے میں کوئی مضمون لکھنے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ بس یونہی گپ شپ ہی کرتے رہنا چاہیے۔ مثلاً اس قسم کی کہ موصوف ادب برائے ادب کے قائل نہیں، البتہ فقرہ برائے فقرہ کے قائل ضرور ہیں۔ مظہرالاسلام نے یہ بات تو میرے بارے میں کہی تھی، مگر یہ صادق امجد اسلام پر آتی ہے کہ اسے اگر کوئی اچھا سا پھڑکتا ہوا فقرہ سوجھے تو وہ یہ فقرہ ضائع نہیں کرتا، بندہ ضائع کر دیتا ہے اور چونکہ یہ فقرے اسے ہر وقت سوجھتے رہتے ہیں، چنانچہ وہ ہر وقت بندے ضائع کرنے میں لگا رہتا ہے۔ آپ یقین جانیں کہ اس معصوم سے شخص کی آدھی دشمنیاں ایسے معصوم فقروں ہی سے جنم لیتی ہیں جو یہ اپنوں اور غیروں کی موجودگی یا عدم موجودگی میں ان کی طرف لڑھکا دیتا ہے۔ میں نے اسے کئی بار کہا ہے کہ تم اپنے طنز و ظرافت سے معمور فقروں کا رخ صرف اپنے دوستوں ہی کی طرف رکھا کرو کہ وہ جانتے ہیں تم ان لمحوں میں صرف ادب برائے ادب کے قائل ہوتے ہو۔ خدا کے لیے اس سلسلے میں غیروں کو معاف کر دیا کرو کہ وہ تمہیں پوری طرح نہ جاننے کی وجہ سے یہ جملے ہضم نہیں کر پاتے اور پھر وہ پورے شہر میں ڈکار مارتے پھرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ عینک کے شیشے میں سے اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے مجھے جھانکتا ہے اور کہتا ہے تم ٹھیک کہتے ہو، آئندہ میں تمہارے سلسلے میں احتیاط برتوں گا۔

امجد کے سلسلے میں بتانے کی ایک بات یہ ہے کہ وہ دوستوں کے ساتھ گپ شپ کے علاوہ کھانے پینے کا بھی خاصا رسیا ہے، چنانچہ وہ جانتا ہے کہ اچھے کباب کہاں سے ملتے ہیں، سموسے کس دکان کے اچھے ہیں، گرم گرم جلیبیاں کہاں سے ملتی ہیں اور

گلبرگ کے کس ریستوران میں اچھا چینی کھانا دستیاب ہوتا ہے اور اس انجمن میں وہ اکیلا نہیں، بلکہ اس کے کچھ راز داں اور بھی ہیں جن میں مظفرؔ بخاری، شمیم اور رضا مہدی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ کھابہ گیر پارٹی ہے اور امجد کی خورد و نوش کی یہ سرگرمیاں اس کی ادبی سرگرمیوں کے "پیرالیل" چلتی ہیں۔ امجد کے دوستوں کا ذکر چھڑا ہے، تو یہ بھی سُن لیں کہ اس کے حلقۂ احباب میں پری چہرہ بھی شامل ہیں، مگر جس طرح اس کی ذات سے آج تک کسی دوست کو نقصان نہیں پہنچا، اسی طرح ان پری چہرہ لوگوں کو بھی اس بے ضرر شخص سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ وہ لطیفے اس سے سنتے ہیں اور حالِ دل غالباً کسی اور سے! حالِ دل سنانے کے متعلق امجد کا کہنا ہے کہ اس سے زیادہ سٹوپڈ چیز دنیا میں اور کوئی نہیں، جبکہ لڑکیاں ہیں کہ یہ رومانی ڈائیلاگ سننے کے لیے بزرگوارم سدھیر تک کی فلم دیکھنے چلی جاتی ہیں۔ ویسے آپس کی بات ہے، مَیں نے ایک روز امجد کو ٹیلیفون پر عشق میں ڈوبے ہوئے ڈائیلاگ بولتے ہوئے خود سنا تھا اور آپس کی ایک بات یہ بھی ہے کہ دوسری طرف ہماری بھابی تھی، جبکہ ایک ستم ظریف کا کہنا ہے کہ بیوی سے عشقیہ گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی ایسی جگہ خارش کرے جہاں خارش نہ ہو رہی ہو!

ایک اور بات جو مَیں امجد کی آڑ میں یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اس دور روزہ زندگی میں بڑے عجیب لوگوں سے پالا پڑتا ہے، مگر میرے لیے سب سے تکلیف دہ لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنی خواہ مخواہ کی پُراسرار سرگرمیوں کی بنا پر سیکرٹ ایجنٹ 007 سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنا راز کسی کو نہیں دیتے، بلکہ "آشکار" کو بھی راز کی طرح چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، مَیں انہیں اللہ تعالیٰ کی "میسنی" مخلوق کہتا ہوں۔ ان سے اگر پوچھا جائے کہ صاحب آپ کہاں کام کرتے ہیں؟ کہیں گے

"پتہ نہیں!" ان سے پوچھیں کہ آپ نے یہ قمیص بہت خوبصورت پہنی ہوئی ہے کہاں سے خریدی ہے، جواب ہوگا "پتہ نہیں" ایسے لوگ زندگی میں بہت کامیاب رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ہونے کا پتہ نہیں دیتے اور آپ کا "پتا" کاٹنے کی کوشش میں مشغول رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک دن وہ آپ کے ہاتھ میں ایک رسید تھماتے ہیں، آپ پڑھتے ہیں، تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے آپ کو کھڑے کھلوتے میں بیچ دیا ہے اور یہ اس کی رسید ہے جو اس لیے دی ہے تاکہ سند رہے کہ آپ خاصے چغد ہیں۔ امجد اسلام انہی سند یافتہ چغدوں میں سے ایک ہے، بلکہ ایک لحاظ سے تو ہیں اور وہ دونوں سند یافتہ چغد ہیں کہ ہم دونوں نے اورنٹیل کالج سے ایم اے اردو کیا ہے۔ یہ "میسنے" لوگوں کے ساتھ اس کا ذکر یوں آ گیا کہ جس طرح اندھیرے کی ضد روشنی ہے، اسی طرح امجد اسلام معاشرے میں پھیلے ہوئے ان سیکرٹ ایجنٹوں کے بالکل برعکس ایک کھلی کتاب کی طرح ہے جسے پڑھنے کے ضمن میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ بلکہ یوں کہہ لیں کہ امجد اسلام "حاتم طائی کا بیٹا" قسم کی ایک سیریز ہے، مگر اس کے لیے آپ کو برس ہا برس "باقی اگلے شمارے" کے چکر میں پڑنا پڑتا، بلکہ دو تین ملاقاتوں میں ہی آپ اس کے بارے میں سب کچھ جان لیتے ہیں؛ تاہم اس میں آپ کا، بلکہ کسی کا بھی کوئی کمال نہیں، کیونکہ امجد اپنے بارے میں کسی کو بھی بھول بھلیوں میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، چنانچہ وہ ملاقات کے فوراً بعد آپ کے سوالات کا انتظار کیے بغیر کہنا شروع کر دے گا "میرا نام امجد اسلام امجد ہے۔ فلیمنگ روڈ پر رہتا ہوں۔ آغا بیدار بخت کا ہمسایہ ہوں۔ اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا، شہرت بخاری میرے استاد تھے وغیرہ وغیرہ۔" سو یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے بہت عزیز ہے، کیونکہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ "میسنے" لوگوں سے مجھے سخت چڑ ہے اور اس کے برعکس ایسے لوگ بہت پیارے لگتے ہیں جو اپنے بارے میں

کچھ بھی چھپانا پسند نہیں کرتے حتیٰ کہ وہ کچھ بھی جو انہیں بہرحال چھپانا چاہیے۔

امجد اسلام قدرت کی ان ستم ظریفیوں کے خلاف سراپا احتجاج بھی ہے، جنہیں عرفِ عام میں ثقہ لوگ سمجھا جاتا ہے — "یہ سمجھا جاتا ہے" کی شرط میں نے یوں عاید کی ہے کہ ثقہ ہونے میں بذاتِ خود کوئی حرج نہیں، البتہ ثقہ بننے کی کوشش اس عمل کو الٹا مضحکہ خیز بنا دیتی ہے؛ چنانچہ اس عمل سے گزرنے والے لوگ آپ نے بھی دیکھے ہوں گے، اگر نہیں دیکھے تو کبھی سبزی کی دکان پر تر و تازہ سبزیوں کے درمیان لُٹے ہوئے کریلے نظر پڑیں، تو بس سمجھ لیں کہ یہ مخلوق بالکل ویسی ہوتی ہے۔ امجد اسلام ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں میں وہ چمک نظر آتی ہے جو بلی کی آنکھوں میں شکار کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے؛ چنانچہ یہ ان پر جھپٹتا ہے اور ایک پنجہ مار کر انہیں چھوڑ دیتا ہے۔ وہ خود کو اس کی دستبرد سے بچانے کے لیے اپنے بل میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں، تو یہ پھر انہیں دبوچ لیتا ہے اور ٹھگتوں کے پنجے مارنے لگتا ہے، حتیٰ کہ وہ ادھ موئے ہو جاتے ہیں اور پھر یہ انہیں اسی طرح چھوڑ کر کسی نئے شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔

امجد کرکٹ کا بہت اچھا پلیئر ہے، بیڈمنٹن بھی کھیلتا ہے، اخبار میں جو خبریں وہ پورے خضوع و خشوع سے پڑھتا ہے، وہ کھیلوں ہی کی ہوتی ہیں؛ اس کی شخصیت میں جو سپورٹس مین سپرٹ ہے، وہ غالباً سپورٹس سے اس گہرے تعلق ہی کی بنا پر ہے۔ میں نے امجد کو بدترین صورتِ حال میں بھی کبھی نروس نہیں پایا، اس کے اعصاب حیرت انگیز طور پر مضبوط ہیں؛ لیکن مجھے امجد کی جس صفت نے خصوصی طور پر حیران پریشان کیا، وہ برِصغیر کی تاریخ پر اس کا عبور ہے۔ اسے حرف

پلے بوائے ہی کے لطیفے یاد نہیں ہیں، برِ صغیر کے شہنشاہوں کے وہ لطیفے بھی ازبر ہیں، جن پر ہنستے ہنستے عوام کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے!

اور یہ سطور لکھتے لکھتے مجھے اچانک احساس ہوا ہے کہ میں نے امجد کے بارے میں گپ شپ کے بجائے کچھ سنجیدہ سا پیرایہ اختیار کر لیا ہے ـــــ دراصل کچھ یہی معاملہ خود امجد کا بھی ہے۔ اس کے پاس سارا دن بیٹھے رہیں، تو وہ اپنی شگفتہ باتوں سے کسی قسم کے فکر یا غم کو آپ کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دے گا، لیکن جب وہاں سے اُٹھ کر آپ اپنے گھر جائیں گے اور کچھ لمحے اس کے کسی شعری مجموعے کی صحبت میں گزاریں گے، تو وہ آپ کو اتنا سنجیدہ نظر آئے گا کہ اگلے دن اس سے ملاقات پر آپ کو باقاعدہ حیرت ہو گی۔ یہ امجد اسلام امجد وہ ہے جو فرد اور معاشرے کے بحران سے آنکھیں چار کرتا ہے جو وطن اور اہلِ وطن کی زبوں حالی دیکھتا ہے، جسے تیسری دنیا کے مسائل کا ادراک ہے جو امریکہ کے پابہ زنجیر نگرد غلاموں کی بیڑیوں کی جھنکار سنتا ہے اور پھر شعری احساس کے ساتھ وہ سب کچھ قلمبند کرتا چلا جاتا ہے، جو اس کے بیشتر ہم عصروں کا مسئلہ نہیں ہے اور اگر یہ سب کچھ کسی کا مسئلہ ہے بھی، تو وہ اپنی بات تجرید کے اتنے پردوں میں چھپا دیتا ہے کہ اسے سمجھنا بذاتِ خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ میں اگر امجد کا زبردست ممنون ہوں تو اس لیے بھی کہ وہ جدید ترین ادبی رویوں کا حامل ہونے کے باوجود اپنے قاری کو شعر پڑھنے کے لیے دیتا ہے اس سے شعر معمے حل نہیں کرواتا۔ اس سے بجھکیں نہیں نکلواتا! یہ میں نے ابھی ابھی تیسری دنیا کا ذکر کیا تھا، اس پر مجھے حضرت مولانا غلام علی اوکاڑوی مدظلہ العالی یاد آ گئے۔ حضرت نے ایک تقریر میں فرمایا: "ایک دنیا تو یہ ہے جس میں ہم تم رہتے ہیں اور ایک دنیا وہ ہے جہاں ہم سب نے ایک دن

جاتا ہے۔ یہ بیچ میں تیسری دنیا کہاں سے آگئی! یہ سوال واقعی امجد سے پوچھنے والا ہے کہ اپنی نسل کے شعرا میں یہی ایک شاعر ہے جس کے پیٹ میں تیسری دنیا کے مروڑ اکثر اٹھتے رہتے ہیں! ویسے میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر امجد اسلام امجد شاعری بھی مزاحیہ کرتا اور وہ مشاعروں میں اپنا یہ کلام دلاور فگار کے ترنم میں سناتا تو کیا ہوتا؟ میرے خیال میں ہونا یہ تھا کہ پھر اس کا نام بھی دلاور فگار ہی ہوتا، امجد اسلام امجد نہ ہوتا۔ امجد اسلام امجد تو وہی ہے جو محفل میں قہقہے لگاتا ہے اور کاغذ پر اداس لفظ لکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں کوشش کے باوجود، اس پر یہ تحریر مکمل نہیں کر سکا اور اسے ادھورا چھوڑ رہا ہوں، کیونکہ بیک وقت قہقہے لگانے والے اور آنسو بہانے والے شخص کے بارے میں لکھتے ہوئے گرم سرد ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ گرم سرد والا لطیفہ تو آپ نے سنا ہی ہو گا۔ اگر نہیں سنا، تو غیر ثقہ حضرات موقع ملنے پر امجد اسلام سے خود سن لیں یا اسے اپنا ٹیلیفون نمبر لکھا دیں۔

●

یا شبنم رُومانی

کراچی میرے لیے باعثِ کشش اس لیے ہے کہ وہاں سمندر ہے اور قائدِ اعظم ہیں،
چنانچہ جب اپنے شہر کی تنگناؤں سے جی گھبرانے لگتا ہے تو میں سمندر اور قائدِ اعظم کے شہر میں
چلا جاتا ہوں۔ کراچی میں میرے کچھ بزرگ بھی ہیں جن سے میں برخورداروں کی طرح ملتا
ہوں، کچھ ہم عصر ہیں جن سے ہم عصروں کی طرح ملتا ہوں۔ کچھ منافق ہیں جن سے منافقوں
کی طرح ملتا ہوں اور کچھ دوست ہیں جن سے دوستوں کی طرح ملتا ہوں۔ میرے ان
معدودے چند دوستوں میں سے ایک شبنم رومانی بھی ہیں جو کراچی میں میرے لیے
اپنے بازو وا رکھتے ہیں۔ ویسے بھی میں ابھی تک یہ طے نہیں کر پایا کہ میری ان سے دوستی
ان کے شبنم ہونے کی وجہ سے ہے یا رومانی ہونے کے ناطے سے ہے۔ یہ طے کرنا اس
لیے مشکل ہے کہ اگر یہ دوستی محض ان کے رومانی ہونے کی وجہ سے ہوتی، تو پھر میرے قریبی
حلقے میں ایوب رومانی اور نجمہ رومانی بھی ہوتے۔ اور اگر وجہ دوستی شبنم ہوتی تو خیر ـــــ!
اس آخری جملے سے کسی کو کوئی غلط مطلب اخذ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ کہنا میں یہ چاہتا ہوں
کہ وجہِ دوستی شبنم بھی نہیں ہے۔ اور صحیح طور پر یہ بات اس لیے نہیں کہہ پایا کہ فن کے
علاوہ عجزِ فن بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔ ایک ٹرین کی ڈائننگ کار میں ایک صاحب
نے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو سگریٹ آفر کیا۔ اس نے معذرت کی کہ وہ سگریٹ نہیں
پیتا۔ تھوڑی دیر بعد ان صاحب نے اس نوجوان کو وہسکی آفر کی، مگر نوجوان نے اس بار

بھی معذرت کی اور کہا کہ وہ شراب نوشی نہیں کرتا۔ اس پر وہ صاحب بہت مرعوب ہوئے اور اس نوجوان سے کہا، ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں میری بیوی اور میری بیٹی ہے۔ میرے ساتھ آؤ، میں تم ایسے صالح نوجوان کو ان سے ملانا چاہتا ہوں۔" اس پر اس صالح نوجوان نے ایک بار پھر معذرت کی اور کہا، "معافی چاہتا ہوں جناب! میں یہ کام بھی نہیں کرتا۔"

اور چونکہ میں بھی ایک صالح نوجوان ہوں اس لیے شبنم رومانی سے میری دوستی نہ شبنم اور نہ رومانی ایسے لفظوں سے جذباتی تعلق کی بنا پر ہے، بلکہ یہ دوستی غالباً شبنم رومانی کے شبنمی مزاج کی وجہ سے ہے۔

اور شبنم رومانی کا شبنمی مزاج دیکھنا ہو تو اس کے لیے ذرا سی زحمت یہ اٹھانا پڑتی ہے کہ اس کے لیے کراچی جانا پڑتا ہے۔ پھر کراچی پہنچ کر حضرت صہبا لکھنوی یا بھائی محمد علی صدیقی کے دفتر سے شبنم رومانی کو محض اپنی آمد کی اطلاع کرنا ہوتی ہے۔ اس کے بعد باقی کام یہ شخص خود کرتا ہے یعنی آپ کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے انہیں اچانک لاہور میں پایا۔ اس اچانک آمد کا احوال پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے ایک عزیز دوست کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے آئے ہیں، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو کراچی میں بیٹھے بٹھائے بھی سرخرو ہو سکتے تھے۔ یعنی دوست کے نام اچانک علالت کا خط اور بیٹی کے لیے بہشتی زیور کا ایک نسخہ ارسال کر دیتے۔ اللہ اللہ خیر سلا، مگر موصوف آٹھ سو میل کا سفر طے کر کے لاہور اور پھر آٹھ سو میل کا سفر طے کر کے واپس کراچی پہنچے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف کو وضع داری نبھانے کا کتنا شوق ہے۔

شبنم رومانی سے میری دوستی کی وجہ اس کے شبنمی مزاج ہونے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ شاعر ہوتے ہوئے بھی وہ شاعروں جیسی حرکتیں نہیں کرتے۔ مثلاً میں نے بہت

سے شاعر دیکھے ہیں جو معصوم اور بھولے بھالے لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنا کلام سنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کی تمام دوستیاں اور دشمنیاں اسی محور کے گرد گھومتی ہیں کہ کون ان کا کلام کتنا سنتا ہے اور کتنی داد دیتا ہے۔ بات اگرچہ دور نکل جائے گی لیکن حکایت چونکہ لذیذ ہے اس لیے سناتے میں کوئی حرج نہیں۔ غضنفر مہدی راوی ہے کہ ملتان کے ایک قصبے فاضل پور میں ایک مشاعرہ تھا جس میں ۱۱۰ شاعر سامعین کی سرکوبی کے لیے موجود تھے۔ ان میں سے ایک شاعر تو ایسا تھا جو سٹیج سے اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ سٹیج سیکرٹری نے اسے منت سماجت کر کے "چونڈیاں" بھر کے اور اس کا دامن حریفانہ کھینچ کھینچ کر کسی نہ کسی طور اسے نیچے اتارا، لیکن سٹیج سے اترتے ہی وہ سیدھا تھانے پہنچا اور ایس ایچ او سے شکایت کی کہ اسے کلام سنانے کا موقع نہیں دیا جا رہا۔ ایس ایچ او غالباً ادب نواز تھا۔ اس نے شاعر مذکور کے ساتھ ایک اے ایس آئی، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو سپاہی روانہ کیے، جنہوں نے پنڈال میں پہنچ کر مشاعرہ رکوا دیا اور سٹیج سیکرٹری کو مخاطب کر کے کہا: "صاحب کا آرڈر ہے کہ ان شاعر صاحب سے دو نظمیں اور سنی جائیں" اور جہاں تک داد کے حوالے سے جان پہچان کا تعلق ہے ـــ گزشتہ ہفتے ایک صاحب عزیزی بیدار سرمدی کے پاس آئے اور بہت گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ جب انہیں دوسری طرف سے اتنی گرمجوشی میسر نہ آئی، تو انہوں نے پریشان ہو کر کہا: "آپ نے غالباً مجھے پہچانا نہیں"۔ بیدار نے نفی میں سر ہلایا تو ان صاحب نے اظہارِ تاسف کرتے ہوئے کہا "کمال ہے صاحب، آپ اتنی جلدی بھول گئے۔ پچھلے سال گوجر خان کے مشاعرے میں مَیں نے آپ کو داد دی تھی۔" گو ان دو حکایتوں سے بات قدرے طویل ہو گئی ہے، لیکن اس سے کم از کم یہ اندازہ تو ضرور ہو جائے گا کہ میرے دل میں شبنم رومانی کے لیے محبت کے اتنے

جذبات کیوں مچلتے ہیں کیونکہ یہ وہ شاعر ہے جو اس معاملہ میں بڑا با لحاظ ہے۔ لاہور سے جو دوست کراچی جاتے ہیں، انہیں کھانے پر بلاتا ہے، گپ شپ کرتا ہے، لطیفے سناتا ہے، مگر انہیں اپنا کلام سناتا ہے، نہ ان سے سنتا ہے، داد دینے یا لینے کا معاملہ تو کہیں بعد میں آتا ہے۔

خیر یہ ساری باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ مرزا عظیم احمد بیگ چغتائی نے اپنا قلمی نام شبنم رومانی کیوں رکھ لیا۔ شبنمی مزاج اپنی جگہ لیکن میں نے شبنم رومانی کے اندر چھپے ہوئے مرزا عظیم احمد بیگ چغتائی کو ایک آدھ بار کروٹ بدلتے بھی دیکھا اور اس طرح کی ایک کروٹ کے دوران کراچی کا ایک مشاعرہ زیر و زبر ہو کر رہ گیا تھا، لیکن مغلوں کی آبرو قائم رکھنے کے لیے ہر بار کوئی مشاعرہ الٹنا، ظاہر ہے، شبنم رومانی کے لیے چنداں آسان نہیں اور نہ ہی اتنا مناسب ہے شاید اسی لیے انہوں نے مناسب سمجھا کہ نام کی لاج رکھنے کے لیے روز روز کوئی مشاعرہ الٹانے کی بجائے مرزا عظیم احمد بیگ چغتائی کی بجائے شبنم رومانی نام رکھ لیا جائے۔ یوں تو یہ مناسب فیصلہ ہے مگر اس میں پرابلم صرف وہی ہے جو روحی کنجاہی کو پیش آتا ہے، روحی کنجاہی کا اصل نام امر الٰہی ہے اور اس کے دفتر کے سبھی لوگ اسے امر الٰہی کے نام سے جانتے ہیں۔ ایک روز اس کا "باس" ایک ادبی پرچے کی ورق گردانی کر رہا تھا جس میں شہزاد احمد اور روحی کنجاہی کی غزلیں آمنے سامنے چھپی تھیں۔ روحی کنجاہی کے باس نے روحی کو مخاطب کیا اور کہا: "امر الٰہی، تمہیں معلوم ہے یہ روحی کنجاہی شہزاد احمد کے ساتھ پھنسی ہوئی ہے۔" اس پر روحی کنجاہی کا ردِ عمل تو پتہ نہیں کیا تھا، لیکن شنید یہ ہے کہ اس کے کئی روز بعد تک شہزاد احمد شہر میں اس کی تردید کرتا رہا۔

لیکن یار! یہ کیا معاملہ ہے کہ میں شبنم رومانی کی شخصیت ہی میں اُلجھ کر رہ گیا ہوں

اس کی شاعری کی طرف دھیان ہی نہیں دے رہا، تو بات دراصل یہ ہے کہ جس روز سے شبنم رومانی کا شعری مجموعہ "جزیرہ" موصول ہوا ہے۔ جگہ جگہ اس کی تعریف کرتے کرتے میرا منہ سوکھ گیا ہے۔ مَیں نے مختلف محفلوں میں اپنے دوستوں سے کہا ہے کہ ہمارے درمیان بہت سے شاعر ایسے ہیں جو اپنا مجموعہ چھپوا کر "ایکسپوز" ہو گئے ہیں اور باقیوں نے ان سے عبرت پکڑ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، لیکن شبنم رومانی بڑے کائیاں نکلے ہیں اپنے قارئین کو اپنی نظمیں غزلیں ایک طویل عرصہ تک بکھری بکھری صورت میں پڑھنے کو دیتے رہے۔ اور جب دیکھا کہ لوگوں نے ہونٹوں پر زبانیں پھیرنا شروع کر دی ہیں تو انہوں نے پھیلی ہوئی جھولیوں میں یہ میٹھا پھل اتار دیا۔ مَیں نے "جزیرہ" پہلے صفحے سے آخری صفحہ تک پڑھا ہے اور یوں بآسانی کہہ سکتا ہوں کہ مَیں نے اتنی ملائمت یکجا نہیں دیکھی۔ شبنم رومانی نے اگر مرزا عظیم بیگ چغتائی والے مضامین بھی باندھے ہیں تو انہیں شبنمی زبان میں لکھا ہے۔ شبنم رومانی کی شاعری فکر اور جذبے کی گہرائیوں سے اُبھرتی ہے اور دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ یہ جملہ جو مَیں نے ابھی ابھی لکھا ہے، ایک گھسا پٹا جملہ ہے مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شبنم رومانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ نئے لفظوں میں لکھا ہے اور جب تک اسے پرکھنے کے لیے نئے لفظ وجود میں نہیں آتے، پرانے لفظ حرفِ رائیگاں ثابت ہوں گے۔ سو مَیں اس کی شاعری کو پرانے لفظوں سے بے حرمت نہیں کروں گا۔ اور آخر میں زیادہ سے زیادہ یہ کہوں گا کہ پیارے تم نے سچی شاعری ہی نہیں کی، اپنی شاعری کے مجموعے کا سچا نام بھی تجویز کیا ہے۔ خدا کرے تمہاری شاعری کا یہ جزیرہ اسی طرح آباد رہے۔

نرم دمِ گفتگو

میری زندگی کا سب سے محیر العقول واقعہ یہ ہے کہ عارف عبدالمتین ایسے بزرگ میرے دوست ہیں۔ ممکن ہے میری اس سٹیٹمنٹ سے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوں اس لیے اس کی وضاحت ضروری ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں خاصا لوفر واقع ہوا ہوں، کیونکہ دوستوں میں بیٹھ کر گندے گندے لطیفے سناتا ہوں اور سنتا ہوں۔ قہقہے لگاتا ہوں اور دوسروں کو قہقہے لگاتے دیکھنا چاہتا ہوں سارا سارا دن بے مقصد گلی کوچوں کی خاک چھانتا ہوں اور رات گئے جب گھر لوٹتا ہوں، تو والد صاحب بجا طور پر کہتے ہیں کہ تم بھی لوفر ہو اور تمہارے دوست بھی لوفر ہیں ـــــ یہ سانحہ صرف مجھ پر ہی نہیں گزرتا، بلکہ حبیب جالب کو بھی ان کے والد محترم اسی خطاب سے نوازتے ہیں اور روزانہ رات کو پوچھتے ہیں کہ آج رات گئے تک کن آوارہ لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہے ہو؟ میں اگرچہ موضوع سے قدرے ہٹ جاؤں گا، مگر یہ واقعہ سنانا ضروری ہے کہ ایک روز حبیب جالب رات کے دس بجے تک چائنیز لنچ ہوم میں سیاسی دوستوں کے ساتھ بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ اس اثنا میں اتفاقاً مولانا عبدالستار خاں نیازی بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے بھی گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا، حتیٰ کہ رات کے بارہ بج گئے۔ مولانا اٹھ کر جانے لگے تو حبیب جالب نے کہا حضرت آج آپ میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائیں۔" مولانا نے

شکریے کے ساتھ معذرت کی، مگر حبیب جالب بضد رہے اور بالآخر انہیں جالب کے گھر جانا پڑا ___ دستک پر جالب کے والد محترم عالمِ غیض و غضب میں باہر نکلے تو شاعرِ عوام نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کو آگے کیا اور کہا "اباجی! آپ روزانہ پوچھتے تھے کہ میں رات گئے تک کن لوفروں کے ساتھ بیٹھا رہتا ہوں میں نے سوچا کہ آج ان سے آپ کی ملاقات بھی کرادوں۔ ان سے ملیں آپ ہیں حضرت مولانا عبدالستار خاں نیازی مدظلہ العالی!" میں نے آج تک یہ حرکت تو نہیں کی کہ کسی روز رات گئے جناب عارف عبدالمتین کو اپنے ہمراہ گھر لے آؤں اور والد صاحب سے کہوں کہ "اباجی! یہ ہیں میرے دوست جن کے ساتھ میں وقت گزارتا ہوں" تاہم اتنا ضرور ہے کہ اپنی مصروفیت کا حساب دینے کے لیے ان کے سامنے جناب عارف، جناب ظہیر کاشمیری اور جناب احمد ندیم قاسمی سے ملاقاتوں کا تذکرہ کرتا رہتا ہوں جس پر وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں: "تم غالباً لوفر تو نہیں ہو، البتہ سرخے اور بے دین ضرور ہو"

احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری اور عارف عبدالمتین کس قسم کے سرخے ہیں اور کس قسم کے بے دین ہیں؟ اس کا ذکر تو پھر کبھی کروں گا، پہلے عارف صاحب کے متین ہونے اور اپنے لوفر ہونے کا بیان مکمل کرلوں، یعنی آپ کو یہ بتالوں کہ آگ اور پانی کا میل کیونکر ممکن ہوا۔ سو معاملہ کچھ یوں ہے کہ میں عارف صاحب سے ملاقات کے دوران تمام خباثتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جی بھر کر سنجیدہ گفتگو کرتا ہوں اور اس وقت تک کرتا ہوں تاآنکہ کلیجہ پھٹتا محسوس ہو۔ جب یہ نازک مقام آنے لگتا ہے، تو اسی وقت ٹریک بدلتا ہوں اور گفتگو کا رخ ہلکی پھلکی باتوں کی طرف موڑ دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ عارف صاحب بھی سنجیدگی اور متانت

کو حسب توفیق بالائے طاق رکھتے ہیں اور میرے قہقہوں میں اپنی دبی دبی ہنسی ملا دیتے ہیں۔ مجھے ان کی یہی ادا پسند ہے کہ وہ ہر وقت اپنی عادات ہی کے خول میں بند نہیں رہتے، بلکہ اس سے باہر بھی نکل آتے ہیں۔ بس ایک معاملہ ایسا ہے جس سے وہ قطعی مجبور ہیں اور وہ ان کا اندازِ گفتگو ہے۔ وہ اتنے دھیمے انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ولی دکنی کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے:

عجب کچھ لطف دیتا ہے شبِ خلوت میں دلبر سوں
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

اور اپنی اس عادت کے باعث وہ بہر حال گھاٹے میں نہیں رہتے۔ میرے اس اندازے کی بنیاد وہ روایت ہے جو حال ہی میں مجھ تک پہنچی ہے۔ روایت یہ ہے کہ ایک روز جناب عارف کسی صاحب سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئے۔ دستک دینے پر ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔ عارف صاحب نے اپنے مخصوص سرگوشی کے لہجے میں پوچھا: ملک صاحب ہیں؟ خاتون نے اسی طرح سرگوشی کرتے ہوئے کہا: نہیں۔ لنگ آؤ (نہیں، اندر آ جائیں) پس ثابت ہوا یہ ہمیں اونچا بولنے والے ہیں جو خسارے میں ہیں اور عارف صاحب جو نرم دم گفتگو نظر آتے ہیں؛ درحقیقت گرم دمِ جستجو ہوتے ہیں۔

خیر یہ دروغ تو میں راوی کے کاندھوں پر ڈالتا ہوں کہ جانتا ہوں عارف صاحب ان دنوں ایسے نہیں ہیں۔ یہ "ان دنوں" کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ عارف صاحب کی ان دنوں کی باتیں جناب طفیل دارا بہت سناتے ہیں جب آتش جوان تھا۔ طفیل دارا، عارف صاحب کے بچپن کے دوست ہیں۔ سو وہ بتاتے ہیں کہ عارف صاحب آج کل جو نظر آتے ہیں وہ دراصل اس جوانِ رعنا کا بڑھاپا ہے جس نے شہرِ خوباں امرتسر کی کھڑکیوں، دریچوں میں ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ ٹھیک ہے صاحب

ایسے ہی ہوں گے، لیکن آج جب کوئی ان سے اس موضوع پر گفتگو کرتا ہے تو وہ "چل چھوڑ" کہہ کر بات کا رخ پھیر دیتے ہیں۔

چلیے چھوڑیے اس بات کو۔ میں آپ کو یہ بتانے چلا تھا کہ عارف صاحب کس قسم کے سرخے ہیں اور کس قسم کے بے دین ہیں۔ سو بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں سرخے کا لفظ سنتے ہی جو تصور ذہن میں ابھرتا ہے وہ ڈان کوئیگزوٹ قسم کا ہے، جس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور وہ بزعم خویش کشتوں کے پشتے لگائے چلا جا رہا ہے اور اس قتلِ عام کی زد میں سامراجی اور قومی روایات دونوں آتی ہیں، تاکہ مساوات کا اصول قائم رہے، جب کہ عارف عبدالمتین صرف انہی کشتوں کے پشتے لگاتے ہیں جن کی اجازت تصورِ انقلاب دیتا ہے اور عارف صاحب کا تصورِ انقلاب بین الاقوامی ہونے کے ساتھ اس پاک سرزمین سے کچھ اس طرح پیوست ہے کہ "من تو شدم، تو من شدی" کی عملی تصویر نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی عمرِ عزیز کا ایک طویل حصہ پابہ زنجیر مظلوموں کو ظلم کے خلاف صف آرا کرنے میں بسر کیا ہے۔ انہوں نے عدل کے ترانے گائے ہیں، غاصبوں کو للکارا ہے اور اپنے قلم سے نوکِ شمشیر کا کام لیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ذاتی زندگی میں اتنے بے داغ نظر آتے ہیں کہ ان کے حوالے سے انقلاب کو طعنہ نہیں دیا جا سکتا، بلکہ انہیں ایک مثبت مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ـــ سو میرے نزدیک عارف عبدالمتین ایسے انقلابی ہیں جنہیں وقت آنے پر انقلاب OWN کرے گا ان کے بارے میں اعلانِ لاتعلقی کا اشتہار شائع نہیں کروائے گا۔

جہاں تک ان کے بے دین ہونے کا تعلق ہے، تو وہ اس لحاظ سے یقیناً بے دین ہیں کہ فضائل مسواک سن کر وجد میں نہیں آتے، لیکن ایک طرح سے وہ

بے دین نہیں بھی ہیں کہ وہ اسلام کو فعّال اور ترقی پسند مذہب سمجھتے ہیں۔ وہ روحانی قدروں پر ایمان رکھتے ہیں اور ایسا وہ کسی دباؤ یا دنیوی تحریص کی بنا پر نہیں کرتے، کیونکہ جب وہ ملحد اور بے دین تھے، تو ڈنکے کی چوٹ اس کا اعلان کرتے تھے۔ وہ اس ضمن میں کسی معاشرتی دباؤ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے سو آج اگر وہ ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ روحانی قدروں پر بھی ایمان رکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ضمن میں وہ دل کی گہرائیوں سے CONVINCE ہیں ورنہ یہ وہ شاخ ہے جو توڑی جا سکتی ہے، مگر اس میں لچک پیدا نہیں کی جا سکتی۔

مَیں عارف صاحب کے نظریاتی بیان میں کچھ اتنا اُلجھ گیا ہوں کہ ان کی شاعری کی بابت گفتگو یاد ہی نہیں رہی، مگر اس سلسلے میں بھی میرا کچھ کہنا یا نہ کہنا برابر ہے کہ ان کی شاعری کے متعدد مجموعے شائع ہو کر اہلِ نظر سے داد پا چکے ہیں۔ ان کا شمار ملک کے ممتاز ترین شعرا میں ہوتا ہے اور ان کے کلام میں متانت کا وہ جوہر پوری طرح عیاں ہوتا ہے جو ان کی شخصیت کا جزوِ لاینفک ہے۔ عارف صاحب نے انقلابی شاعری کی تو ثابت کیا کہ انقلاب اور شعریت کے باہمی تعلقات کشیدہ نہیں ہیں، بلکہ یہ دونوں خصوصیات باہم شیر و شکر نظر آ سکتی ہیں؛ چنانچہ ان کی شاعری کا یہ حصہ نعرہ بازی کے بجائے متانت کا حامل نظر آتا ہے —— یہی متانت اپنے دامن میں شعریت کی دولت لیے ہوئے ہے۔ عارف صاحب نے رومانی، بلکہ جسمانی شاعری بھی کی، مگر ان جذبوں کو پلید لفظوں سے آلودہ نہیں ہونے دیا، تاہم ان کی ایک کنٹری بیوشن غالباً ایسی بھی ہے جو اس سے پہلے اردو شاعری میں نظر نہیں آتی اور وہ ان کی گھریلو شاعری ہے۔ انہوں نے اپنے بچّوں اور بیوی کے حوالے سے کچھ ایسی نظمیں بھی کہی ہیں جو اپنے تاثر اور وسعت کی بدولت گھر کی

دہلیز پار کر کے قومی اور بعض صورتوں میں بین الاقوامی سرحدوں پر دستک دیتی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح فردیات کو باقاعدہ صنفِ سخن کی شکل بھی عارف عبدالمتین نے دی ہے اور اب اس انجمن میں ان کے کئی اور رازداں بھی پیدا ہو گئے ہیں ـــــ عارف عبدالمتین کا پنجابی مجموعۂ کلام "اکلاپے دا مسافر" بھی شائع ہو چکا ہے اور اگر میں اس کے بارے میں اپنی رائے کا دیانتدارانہ اظہار کر دوں، تو پنجابی کے کچھ ٹھیکیدار مجھ سے ناراض ہو جائیں گے ـــــ عارف صاحب سے بھی ناراض ہو جائیں گے۔

عارف عبدالمتین کے نظریات کا ذکر کرتے ہوئے میں ان کی شاعری کو بھول گیا تھا اور شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تنقید نگاری فراموش ہونے لگی تھی۔ "امکانات" ان کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے جو زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا ہے اور باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ تنقید میرا میدان نہیں، اس لیے اس کے بارے میں کوئی سکہ بند قسم کی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ "امکانات" میں وہ ایک ہمدرد نقاد نظر آتے ہیں۔ گوشت کی دکان پر بیٹھے ہوئے قصائی نہیں، جس نے چھری پاؤں کے انگوٹھے میں پھنسائی ہوتی ہے اور بے زبانوں کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر پرے پھینکتا جاتا ہے ـــــ اور چلتے چلتے ایک بات مجھے یہ بھی کہنی ہے کہ شاعر عبدالمتین، نقاد عبدالمتین، انقلابی عبدالمتین اور عارف عبدالمتین کے علاوہ ایک شخصیت فولادی عبدالمتین کی بھی ہے جس کے جسم کو بیماری کے آسیب نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، مگر وہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو کسی مفید مصرف میں لانے کے لیے مسلسل جدوجہد میں مشغول رہتی ہے۔ یہ شخصیت بھی عارف عبدالمتین کی ہے؛ چنانچہ وہ بیماری کے سخت حملے کے دوران میں بھی میرے اور آپ کے لیے ان تخلیقات کے ڈھیر لگانے میں لگے رہتے ہیں جن میں عالمی ہمدردیوں

کی خوشبو ہے اور خاکِ وطن کی مہک ہے۔

گفتگو دراز ہوتے ہوتے کچھ اتنی سنجیدہ ہو گئی ہے کہ کلیجہ پھٹنے والا مقام بہت قریب آن پہنچا ہے اور یہ وہ موقع ہے جب میں فوراً ٹریک بدل لیا کرتا ہوں اگر ٹریک بدلنا ممکن نہ ہو تو چُپ شاہ کا روزہ رکھ لیا کرتا ہوں۔ میں اس ضمن میں ٹریک بدلنے کے بجائے خاموش رہنا زیادہ پسند کروں گا، کیونکہ بصورتِ دیگر عارف صاحب حسبِ معمول پہلے کچھ دیر تک میری غیر سنجیدہ گفتگو پوری سنجیدگی سے سنیں گے اس کے کافی دیر بعد ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئے گی اور پھر ان کی دبی دبی ہنسی میرے قہقہوں میں تحلیل ہوتی جائے گی —— اور اس کی تفصیل والد محترم تک پہنچ گئی، تو سارا دن بے مقصد گلی کوچوں کی خاک چھاننے کے بعد جب رات کو گھر لوٹوں گا، تو وہ بجا طور پر کہیں گے کہ "تم بھی لوفر ہو اور تمہارے . . ."

تمغۂ امتیاز

جناب احسان دانش کے ساتھ مشاعرہ پڑھنا ایک انتہائی خوشگوار فعل ہے اور ان کے ساتھ سٹیج پر بیٹھنا قدرے مشکل کام ہے، کیونکہ اس صورت میں محفل سے نکالے جانے کے امکانات خاصے روشن ہوتے ہیں۔ یہ بات میں تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ گو یہ تجربہ ادھورا ہے، کیونکہ محفل سے نکالے جانے کی نوبت متعدد بار بس آتے آتے رہ گئی ہے۔ معاملہ کچھ یوں ہے کہ سٹیج پر احسان صاحب کھدر کی قمیض اور پائجامہ پہنے سر پر ٹوپی رکھے، متانت اور سنجیدگی کی تصویر بنے بیٹھے ہوتے ہیں، لیکن ان کی اس متانت اور سنجیدگی کا صحیح احوال ان کے برابر میں بیٹھا ہوا وہ شخص لگا سکتا ہے جس کے کان میں احسان صاحب ہولے سے کوئی جملہ کہہ دیتے ہیں۔ یہ جملہ احسان صاحب نے کسی شاعر پر کسا ہوتا ہے اور اتنا بھرپور ہوتا ہے کہ سننے والے کو اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے، چنانچہ وہ بیچارا آشوبِ قہقہہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، کبھی اپنے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپنے کی کوشش کرتا ہے کبھی اپنے قہقہے کو دبی دبی ہنسی میں تبدیل کرنے کی تگ و دو کے دوران اپنے چہرے کی رگیں سرخ کر لیتا ہے اور کبھی ان تمام کوششوں کے باوجود آؤٹ آف کنٹرول ہونے کے خدشہ کے سبب اسے سٹیج سے اٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا پڑتا ہے۔ زیادہ تکلیف دہ صورت یہ ہوتی ہے کہ احسان صاحب ہولے سے یہ جملہ

ادا کرنے کے بعد پہلے سے زیادہ متین اور سنجیدہ نظر آنے لگتے ہیں۔ محفل میں موجود سامعین حتیٰ کہ سٹیج پر بیٹھے شعرا کو بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ احسان صاحب کے برابر میں بیٹھے ہوئے جس شخص کی حالت غیر ہو رہی ہے وہ احسان صاحب ہی کی بدولت ہے۔ ایک محفلِ مشاعرہ میں ایک بھاری تن و توش کے شاعر بھی موجود تھے جو بیٹھے بیٹھے سو جانے کے عادی ہیں اور سو جانے کے دوران میں ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔ موصوف اس روز بھی سٹیج پر بیٹھے بیٹھے سو گئے اور کچھ اسی عالم میں کہ منہ کھلا ہے اور گہری گہری سانسیں لے رہے ہیں۔ احسان صاحب نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر اپنے برابر بیٹھے ہوئے ایک شاعر کے کان میں کہا "ذرا یہ سامنے تو دیکھو، لگتا ہے کسی گوریلے کو گولی لگی ہے!" اس کے بعد ان کا ہم نشست اپنی ہنسی پر قابو پانے میں مشغول ہو گیا اور احسان صاحب متانت اور سنجیدگی کی تصویر بنے اپنی دوسری جانب بیٹھے ہوئے شاعر کے کان میں سرگوشی کرنے لگے۔

جناب احسان دانش کو حال ہی میں ان کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ امتیاز دیا ہے۔ ساہی وال کے مشاعرے میں مَیں نے احسان صاحب کو اس پر مبارک پیش کی، تو بولے "میاں، مبارک چھوڑو ایک حکایت سنو۔ کسی بادشاہ نے ایک روز خوش ہو کر اپنے حجام کو سند دی کہ تم حجامت بہت اچھی بناتے ہو۔ حجام خوشی سے پھولا گھر آیا اور کمرے میں اُلٹ بازیاں لگانے لگا اس کی والدہ نے اس کی حالت غیر دیکھی تو وجہ دریافت کی۔ حجام نے بتایا کہ بادشاہ نے اسے حجامت میں ماہر قرار دیا ہے۔ یہ سن کر والدہ نے کہا: ارے بے وقوف اس ضمن میں اپنے آپ کو ماہر اس روز سمجھنا جب اس فن کے ماہر تمہاری مہارت کے معترف ہوں" سو میاں، ہم تو خود کو اس روز سند کے اہل پائیں گے۔

جب ہماری برادری کے لوگ بھی ہمیں اس کا اہل سمجھیں گے۔" یہ واقعہ میں نے اس لیے بیان کیا ہے کہ احسان صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو جو اس میں پوری طرح جھلکتا ہے، وہ ان کی طبیعت کا انکسار ہے۔ نصف صدی تک ادب کے میدان میں اپنی عظمت تسلیم کرانے کے باوجود خود کو کچھ بھی نہ سمجھنا، ان دنوں ایک عجیب و غریب فعل کے زمرے میں آتا ہے کہ یار لوگ تو آج کل ٹگھوڑے ہی میں خود کو صاحبِ طرز ادیب سمجھنا شروع کر دیتے ہیں، بلکہ نقادوں کو بھی چپکے چپکے سمجھانا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ "صنعتِ تضاد" احسان صاحب کی ساری شخصیت میں کارفرما نظر آتی ہے، یعنی چہرے مہرے سے خوفناک حد تک سنجیدہ لگتے ہیں، لیکن انتہائی شگفتہ انسان ہیں۔ ایک طویل عرصے سے مستند شاعر کی حیثیت سے ادب کے میدان میں موجود ہیں، لیکن خود کو کچھ نہیں سمجھتے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ وہ دیگر امور میں بھی "چھاکا" دے جاتے ہیں۔ مثلاً وہ عمر کے جس پیٹے میں ہیں اور بظاہر جدید ادبی رویوں سے جس طرح دُور نظر آتے ہیں، حقیقتاً شاعری میں در آنے والی جدید ترین قدروں سے بھی آگاہ ہیں اور ان میں سے مثبت قدریں زمانے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں رچ بس جاتی ہیں؛ ان کے اشعار سن کر کبھی تو یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ اپنے "ہم عمروں" میں نہیں اپنے "ہم عصروں" میں جی رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان نسل کے معتدل شاعر ان سے الرجک نہیں ہیں، بلکہ انہیں ماضی کے علاوہ آج کے حوالے سے بھی پہچانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں!

احسان دانش مزدور کے بیٹے ہیں اور ان کی اپنی عمر شدید محنت میں بسر ہوئی ہے، انہوں نے محنت کی عظمت اور محنت کشوں کی عسرت پر اتنا کچھ لکھا

ہے کہ انہیں شاعرِ مزدور کہا جاتا ہے اور یہیں ان کی شخصیت کا ایک اور "تضاد" اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ "تضاد" بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ شاعرِ مزدور" ہونے کے باوجود وہ سرمایہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر شراب نہیں پیتے، بلکہ انہوں نے زندگی بھر اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ان کی شاعری کے مجموعے روسی زبان میں ترجمہ ہو کر ایک بڑی تعداد میں شائع ہوئے ہیں، لیکن بایں ہمہ وہ روس کے "نفیسد خوال" نہیں ہیں، وہ سچے مسلمان اور کٹر پاکستانی ہیں۔ یوں انہوں نے اپنے اوپر ترقی کے دروازے خود بند کر لیے ہیں اور شاعر کا کہنا ہے کہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

احسان صاحب کی شخصیت کے جس ایک پہلو نے مجھے کچھ عرصہ پیشتر بے حد پریشان کیا ہے، وہ ان کا بڑا شاعر اور بڑا انسان ہونے کے علاوہ ایک انتہائی خوبصورت نثر نگار ہونا بھی ہے۔ میں نے ان کی آپ بیتی "جہانِ دانش" کا مطالعہ شروع کیا تو ایک ایک صفحے پر نئی حیرتوں کے در کھلتے چلے گئے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی دلچسپ، اتنی بھرپور اور اس قدر خوبصورت نثر کی حامل سوانح عمری نہیں پڑھی "جہانِ دانش" کی نثر آج کی نثر ہے جس میں کلاسیکی حسن پوری ہمہ گیری کے ساتھ رچا بسا ہے۔ اس میں دیگر چیزوں کے علاوہ کردار نگاری اس کمال کی ہے کہ قاری اس کے طلسم میں گم ہو جاتا ہے۔ "جہانِ دانش" ایک اعلیٰ انسان کی اعلیٰ زندگی کا مرقع ہے جسے خوبصورت لفظوں میں تحریر کیا گیا ہے۔

آخر میں مجھے ایک بات اپنے قارئین کے، بجائے احسان صاحب کو بھی بتانا ہے اور وہ یہ کہ حضور! حکومت کی طرف سے تمغۂ امتیاز آپ کو اب ملا

ہے، لیکن فن کے ماہرین آپ کو یہ سند بہت پہلے عطا کر چکے ہیں اور اب تو آپ خود اس مسند پر ہیں جہاں سے یہ اسناد دوسروں میں بانٹی جاتی ہیں اور مستند سمجھی جاتی ہیں۔ سو وہ حکایت آپ پر فِٹ نہیں ہوتی جو آپ نے مجھے ساہیوال کے مشاعرے میں سُنائی تھی؛ البتہ اس کا انطباق کچھ دوسرے شاعروں پر بآسانی ہو سکتا ہے؛ لہٰذا کسی مشاعرے میں ان سے ملاقات ہو، تو یہ حکایت ہولے سے ان کے کان میں انڈیل دیجیے!

تحسین فراقی

میں تحسین فراقی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ عبدالعزیز خالد کا مداح ہوا کرتا تھا، بلکہ تحسین فراقی بھی مجھے اس وقت سے جانتا ہے جب میں بھی عبدالعزیز خالد کا مداح ہوا کرتا تھا۔ آج اس واقعے کو قریباً پانچ برس گزر گئے ہیں اور اس عرصے میں پلوں کے نیچے سے کتنا ہی پانی بہہ چکا ہے، یعنی عبدالعزیز خالد شاعری کی منزلیں طے کرتے کرتے کہیں کے کہیں پہنچ چکے ہیں اور اب عبدالعزیز خالد کے سلسلے میں ہم دونوں کی مداحی، مداحی کی حدود سے نکل کر عقیدت کی حدود میں داخل ہو گئی ہے کہ ان کا ذکر ہمیں ان کے ہم عصروں کے ساتھ نہیں اب اقبالؒ کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔ اقبالؒ اور عبدالعزیز خالد کا ذکر ایک سانس میں کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے خدانخواستہ کوئی سانس کی تکلیف ہے، بلکہ اس کا ایک پس منظر ہے۔ دروغ برگردن والاراوی بیان کرتا ہے کہ خالد صاحب دورانِ گفتگو اقبالؒ کے ساتھ اپنے اتفاقات کے علاوہ اختلافات کا ذکر بھی کیا کرتے تھے، جو اُن کے ایک کلرک کو سخت ناگوار گزرتا تھا، مگر وہ ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا، کیونکہ ایک تو خالد صاحب اس کے افسر تھے اور دوسرے جتنے بڑے افسر ہیں اس سے کئی گنا بڑے وہ عالم ہیں، چنانچہ وہ ان کی مدلل گفتگو سنتا تھا اور خون کے گھونٹ پیتا تھا، کیونکہ اس جاہل عاشق کے پاس اتنے بڑے عالم کے اعتراضات کا کوئی

جواب نہیں تھا۔ ایک روز لوگوں نے دیکھا کہ یہ کلرک اپنے ساتھ ایک صاحب کو لیے خالد صاحب کے دفتر میں داخل ہو رہا ہے۔ یاروں نے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ اس نے کہا میں انہیں خالد صاحب کے پاس لے جا رہا ہوں، یہ اقبالؒ پر خالد صاحب کے اعتراضات کا جواب دیں گے۔ یاروں نے پوچھا تم اسے خالد صاحب ایسے دیو سے ٹکرانے لے جا رہے ہو، یہ کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں کہ نہیں؟ بولا صاحبو! یہ بہت عالم فاضل آدمی ہیں" یاروں نے کہا تمہیں کیسے پتہ ہے؟ بولا چند سوز پیشتر ایک ادبی محفل میں کسی شخص نے اقبال پر اعتراض کیا، انھوں نے اسے ایسا جواب دیا کہ وہ آگے سے بول نہیں سکا۔ دوست اس پر متجس ہوئے اور پوچھا ان صاحب نے جواب میں کیا کہا تھا؟ اقبال کے اس عاشق نے بتایا کہ انھوں نے جواب میں صرف ایک جملہ کہا تھا اور وہ یہ کہ اب اگر تم نے اقبال کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالا، تو میں تمہیں اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دوں گا! مگر اپنے خالد صاحب ایسے عالم نہیں ہیں، وہ تو آزادیٔ اظہار کے بڑے زبردست مبلغ ہیں، چنانچہ مجھے یقین ہے کہ وہ میری اس گفتگو کا بھی برا نہیں مانیں گے، بلکہ وہ اب جب کبھی مجھے ملیں گے، تو ان کے چہرے پر وہی دلنواز مسکراہٹ ہو گی اور وہ مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنے تیز تیز لہجے میں کہیں گے "بہت اچھا تھا، بہت اچھا تھا، بہت اچھا تھا!"

مگر برا ہو اس آوارہ خیالی کا کہ بات تحسین فراقی کے کورٹ سے نکل کر عبدالعزیز خالد کی کورٹ میں چلی گئی، حالانکہ تحسین فراقی کے بارے میں میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ یہ شخص شروع سے مذہبی میلانات رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ادب کا نہایت سکہ بند قسم کا طالب علم بھی ہے، چنانچہ وہ ان دونوں حوالوں

سے عبدالعزیز خالد کو جاننا اور ماننا تھا ہی نہیں، جاننا اور ماننا بھی ہے۔ اس نے ماضی میں عبدالعزیز خالد پر جتنے مضمون لکھے ہیں اور مستقبل میں جتنے باندھنے کا ارادہ رکھتا ہے، ان سے اس کا ایک علیحدہ تنقیدی مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔
دراصل تحسین فراقی کو تنقید لکھنے میں ایک سہولت یہ حاصل ہے کہ وہ خود بہت اچھا شاعر ہے، چنانچہ ایک شاعر جب تنقید لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ اسے بے وزن نہیں ہونے دیتا۔ تحسین فراقی تو وزن کے معاملے میں یوں بھی جابر علی سید واقع ہوا ہے۔
یہ جابر علی سید کے ذکر کے ساتھ خدا جانے مجھے رشید احمد صدیقی کیوں یاد آ گئے ہیں؛ شاید اس لیے کہ مجھے رشید احمد صدیقی کے بارے میں ہمیشہ یہ گمان گزرا ہے کہ وہ کوئی مزاحیہ مضمون لکھنے کے بعد اس کی تقطیع کرتے ہیں اور جہاں جہاں کوئی لفظ اس تقطیع سے باہر نظر آیا، اسے کان سے پکڑ کر نکال باہر کرتے ہیں؛ چنانچہ جو مضمون ہم پڑھتے ہیں اس میں مزاح ہو نہ ہو، وہ ناپ تول کے اعشاری نظام کے عین مطابق ضرور ہوتا ہے۔ میں اور امجد اسلام رشید احمد صدیقی کی انشا پردازی ان کی شگفتہ نگاری اور ان کی تنقیدی صلاحیتوں کے معترف ہیں جب کہ تحسین فراقی انہیں زبردست طنز و مزاح نگار بھی مانتا ہے۔ ہم نے کئی دفعہ اسے کہا کہ وہ اپنے اس دعوے کے لیے ثبوت بھی فراہم کرے، چنانچہ اس نے کئی دفعہ ہمیں رشید صاحب کے مضامین کی کوٹیشنیں سنائیں اور اس دوران وہ ہنس ہنس کر دہرا بھی ہوتا چلا گیا، لیکن ہمیں سنجیدہ دیکھ کر وہ اچانک ٹھٹکا اور پوچھا تم لوگ ہنسے کیوں نہیں؟ ہم نے اسے کہا کہ ہم بزرگوں کے ادب کے قائل ہیں؛ ان کی باتوں پر اس طرح ہنسنا نہیں چاہیے!
اور ہاں اس ہنسنے کے حوالے سے یاد آیا کہ یہ شخص جس کا نام تحسین فراقی ہے

اپنے تمام تر زہد و تقوے کے باوجود بات بات پر قہقہے لگانے سے باز نہیں آتا، اسے ہم نے کئی دفعہ کہا کہ کیوں اپنی نیکیاں ضائع کرتے ہو، مگر یہ شخص ہماری اس تنبیہ کو بھی قہقہوں میں اڑا دیتا ہے۔ اور تو اور بعض ایسے لطیفوں پر بھی ہنستا ہے جن کے سننے والے پر بھی حد جاری ہو سکتی ہے۔ موصوف کے بارے میں گزشتہ دنوں موصوف ہی نے ایک انکشاف یہ کیا کہ شادی سے پہلے ایک نہایت والہانہ قسم کا عشق بھی فرماتے رہے ہیں، مگر یہ عشق کچھ ایسا تھا کہ موصوف اس عفیفہ کو بس دور ہی سے دیکھا کیے اور کبھی اس سے حالِ دل نہیں کہا۔ ہم تو اس عشق کو بھی بہرحال عشق ہی کہتے ہیں مگر کچھ لوگوں نے اس کے لیے کوئی اور نام رکھا ہوا ہے۔

تحسین فراقی کے بارے میں ایک خوشخبری تو میں نے سنائی ہی نہیں اور وہ یہ کہ پورے آٹھ سال کے بعد اس کی بیک وقت دو تخلیقات ان دنوں منظرِ عام پر آئی ہیں، ایک تو اس کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "جستجو" ہے اور دوسرے اس کے ہاں ایک خوبصورت بیٹے کی ولادت ہے جس کی تقریبِ مسرت گزشتہ دنوں شبستان میں منعقد ہو چکی ہے، جب میں نے یہ دوسری خوشخبری سنی تو مجھے وہ پیر صاحب یاد آ گئے جن کا مرید ان کے آستانے پر حاضری دینے کے لیے گیا تو وہاں پر لوگوں کا ایک ہجوم دیکھ کر حیران رہ گیا، اس نے ایک شخص سے پوچھا آج یہاں اتنے سارے لوگ کیوں جمع ہیں؟ اس شخص نے جواب دیا، پیر صاحب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے، لوگ مبارکباد دینے کے لیے جمع ہیں، اس پر اس سادہ دل مرید نے حیرت سے کہا "ہیں! پیر صاحب بھی یہ کام کرتے ہیں؟"

یہ جو میں ادھر اُدھر کی باتیں کر کے تحسین فراقی کی تنقیدی بصیرت کو خراجِ تحسین

ادا کرنے سے گریز کی کوشش کر رہا ہوں تو وہ اس لیے کہ دوسرے کے ہنر کا اعتراف کرنا اہلِ ہنر کا کام نہیں، کیونکہ بقول ابنِ انشا یہ مشرقی آداب کے منافی ہے، ورنہ میں آپ کو بتا سکتا تھا کہ یہ شخص کس قدر صاحب مطالعہ ہے۔ عربی، فارسی انگریزی اور اردو ادب کا مطالعہ جتنا تحسین فراقی نے کیا ہے، اس عمر میں بہت کم لوگ اس کے مقابل آتے ہیں۔ وہ گفتگو میں اپنی علمی برتری ثابت کرنے کے جواز تلاش نہیں کرتا، البتہ اگر اس کا موقع آجائے تو پھر وہ یہ موقع ہاتھ سے جانے بھی نہیں دیتا، مگر مجھے ان اعتراضات کی کیا ضرورت ہے، لیکن چونکہ دنیاداری بھی کوئی چیز ہے، لہٰذا اتنا سا اعتراف کرنا میری مجبوری ہے کہ تحسین فراقی نے تنقید کے میدان میں بصورتِ جستجو "بہت سے جغادری قسم کے نقادوں پر بھی اپنی برتری ثابت کر دی ہے۔ ایک دفعہ راولپنڈی سے لاہور آتے ہوئے ریل کار میں مجھے ایک بزرگ ملے تھے جن کی ایک خوبصورت بات مجھے نہیں بھولتی۔ انہوں نے کہا میرے عزیز! ایک شاعر کا مذہبی ہونا اتنا ضروری نہیں، جتنا ایک مذہبی آدمی کے پاس پوئٹک وژن ہونا ضروری ہے۔ دراصل ننھی منی داڑھی والے تحسین فراقی کے پاس یہ پوئٹک وژن موجود ہے۔ یہ پوئٹک وژن انسان کو جن سنگھی بننے سے روکتا ہے، چنانچہ جب وہ تنقید کا ترازو ہاتھ میں پکڑتا ہے تو وہ اپنے تعصبات کو باٹ کے طور پر استعمال نہیں کرتا، اور یوں نعیم صدیقی اور حبیب جالب دونوں صاحب ضمیر شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے بھی اس مذہبی آدمی کے ساتھ اس کا پوئٹک وژن موجود رہتا ہے۔ اردو تنقید کے دس سالوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے میرے اور اپنے کتنے ہی مشترکہ دوستوں کو ناراض کر لیا، مگر خود کو اور دوسروں کو دھوکہ نہ دیا۔ دراصل

سود و زیاں سے بے نیازیہ رویّہ اس وقت بھی جنم لیتا ہے جب لکھنے والا
ادیب کے ساتھ نہیں، ادب کے ساتھ کمیٹڈ ہو۔ ادب کے ساتھ کومٹمنٹ،
اختلافات اور اتفاقات سے قطع نظر، احتشام حسین، محمد حسن عسکری، فتح محمد ملک
سلیم احمد، سراج منیر اور تحسین فراقی پیدا کرتی ہے اور ادیب کے ساتھ کومٹمنٹ
مزارع قسم کے نقادوں کو جنم دیتی ہے۔ خدا ان مزارعوں کی خودی بھی بیدار کرے۔

شہباز اور ممولے

ابنِ انشا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پنجاب والے جتنا دھیان اپنی صحت کا رکھتے ہیں، کاش اتنا اپنی زبان کی صحت کا بھی رکھیں اور یو پی والے جتنا دھیان زبان کی صحت کا رکھتے ہیں کاش اتنا اپنی صحت کا بھی رکھیں۔ شہباز ملک اگرچہ یو پی والے نہیں، پنجاب والے ہیں مگر یہ اپنی صحت کا بھی زیادہ دھیان نہیں رکھتے تاہم خدا کا شکر ہے اس کے باوجود وہ ممولے نہیں شہباز ہی لگتے ہیں لیکن ذرا "ڈھیلے مٹھے" سے لگتے ہیں! اور یہ ان کا "ڈھیلا مٹھا" ہونا صرف دیکھنے کی حد تک ہے۔ ورنہ یہ شخص اپنے اندر اتنی بجلیاں بھرے ہوئے ہے کہ سراپا برقی ہیلتھ کلینک نظر آتا ہے۔ یہ شہباز وہ ہے جو ممولوں ہی پر نہیں شہبازوں پر بھی جھپٹتا ہے اور اس کے نتائج کی اسے کبھی پرواہ نہیں ہوتی۔ ملک صاحب سے بلکہ شہباز صاحب سے میری ملاقات کچھ بہت زیادہ پرانی نہیں اور نہ ہی اس ملاقات میں فراوانی کا عنصر شامل ہے، تاہم جب بھی ان سے ملا ہوں، ان کے متعلق میرا یہ تاثر قائم رہا کہ موصوف نظریہ پاکستان پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی کی نہیں سنتے، حتیٰ کہ ڈاکٹر وحید قریشی کی بھی نہیں سنتے۔ یہ بات میں یوں کہہ رہا ہوں کہ ملک صاحب اس سلسلے میں خالص پنجابی واقع ہوئے ہیں۔ ڈانگ موڈھے پر رکھ کر گھر سے نکلتے ہیں اور جس کے متعلق انہیں شبہ بھی ہو جاتا ہے کہ یہ

شخص اسلام اور پاکستان سے مخلص نہیں۔ اس پر بسم اللہ الشافی" پڑھ کر "ڈانگ" چلا دیتے ہیں اور آپ یقین جانیں یہ شہباز ملک ہی کا حصہ ہے ورنہ یار لوگ تو گھنٹوں تولتے رہتے ہیں اور اس کے بعد بھی نہیں بولتے۔ اپنے ارد گرد ایسے لوگوں کی بھانت دیکھ کر کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ ہم میں انسان کم اور کیلکولیٹر (CALCULATOR) زیادہ ہو گئے ہیں جو ہر وقت جمع تفریق اور نفع و نقصان کے سوال حل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ شہباز ملک چونکہ مسلمان ہیں اس لیے حساب میں کمزور ہیں انہیں یہ جمع تفریق نہیں آتی۔ انہیں یہ نفع نقصان کے سوال نہیں آتے۔ اس کیلکولیٹر سے مجھے وہ شعرا یاد آ گئے ہیں جو ۱۹۷۷ء تک ماؤ کیپ پہن کر ریڈیو ٹیلیویژن کے کمپاؤنڈ میں نظر آتے تھے اور پروڈیوسروں کو اپنی ماؤ کیپ سے ڈراتے تھے اور ۱۹۷۷ء کے بعد سے آج تک یہ شاعر جناح کیپ میں ریڈیو اور ٹیلیویژن کے کمپاؤنڈ میں نظر آتے ہیں اور پروڈیوسروں کو اپنی جناح کیپ سے ڈراتے ہیں، حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ڈرامے اسی وقت کام آتے ہیں جب انسان خدا سے ڈرتا ہو۔ پس ثابت ہوا کہ ڈرانے والے انسان کو خود بھی ڈرنا چاہیے۔ شہباز ملک ڈراتے بھی ہیں اور ڈرتے بھی ہیں اور اسی لیے مجھے اچھے لگتے ہیں۔

شہباز ملک کے اچھے لگنے کی تازہ ترین وجہ ان کی تازہ ترین کتاب "آزادی دے مجاہد لکھاری" بھی ہے جو انہوں نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لینے والے شعرا کے تعارف کے لیے لکھی ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں ان ۴۴ شعرا کا تذکرہ ہے جنہوں نے پاکستان کی جنگ میں اپنی شاعری کے ذریعے قوم کا حوصلہ بلند کیا۔ ان میں سے بیشتر کا شمار عالم فاضل قسم کے شعرا میں نہیں ہوتا، بلکہ ان کی وضع قطع بھی خاصی دقیانوسی ہے ان کا تعلق اس طبقے سے ہے جسے خواص "عوام کالانعام" کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ دھوتی

پہننے والے شاعر ہیں جو گرمیوں میں قمیص اتار کر کاندھوں پر ڈال لیتے ہیں اور ہاتھ میں کھجوری پنکھا لے کر اپنے گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھے ہوتے ہیں یا کسی کھلی گراؤنڈ میں جمع ہو کر ایک دوسرے کو اپنے شعر سناتے ہیں۔ قائدِ اعظم کے دل کی دھڑکن انہی شاعروں نے سنی اور انہوں ہی نے اپنے جیسے لاکھوں لوگوں کو اپنے شعروں سے اسی دھڑکن کا امین بنا دیا۔ دراصل تحریکِ پاکستان کے دوران اگرچہ اُردو کے بھی بڑے بڑے نامی گرامی شاعر موجود تھے، لیکن پرابلم یہ تھا کہ وہ سب پڑھے لکھے تھے۔ انہیں قائدِ اعظم کے مسائل کا بھی علم تھا اور ماسکو کی الجھنیں بھی ان کے مدِ نظر تھیں، چنانچہ انہوں نے اس تاریخی موقع پر یا تو چپ سادھ لی اور یا پھر اپنے علم و فضل اور اپنے "کیلکولیٹر" ہونے کے باعث جمع تفریق اور نفع نقصان کے سوال حل کرنے میں مشغول ہو گئے جس کے نتیجے میں ان پر آشکار ہوا کہ پاکستان بننے میں پاکستان کا فائدہ ہی فائدہ اور ماسکو کا نقصان ہی نقصان ہے۔ لہٰذا آخری چند مہینوں کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے آقاؤں کے بچاؤ کے لیے اپنے قلم کو استعمال کیا اور آخر میں جب انہیں ہدایت موصول ہوئی کہ چونکہ اب پاکستان کے قیام کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی، لہٰذا اب اس کی حمایت کرو تاکہ بعد میں اس کی مخالفت بھی کر سکو تو انہوں نے اپنے قلم کو پاکستان کی حمایت کے لیے پچکارنا شروع کر دیا۔ بہرحال اس وقت ایک شاعر اور بھی تھا جس کا نام اقبال تھا اور علم و فضل میں بھی جس کا ہم پلہ کوئی نہیں تھا، مگر وہ بھی گرمیوں میں بنیان اتار کر ہاتھ میں کھجوری پنکھا پکڑے گھر کے تھڑے کے باہر بیٹھنے والوں میں سے تھا۔ سو اس نے قائدِ اعظم کی ہم نوائی ہی نہیں کی بلکہ تصورِ پاکستان کا خالق بھی وہی تھا، سو پتہ چلا کہ پاکستان انہی شاعروں نے بنایا جن

کی جڑیں اس زمین میں دور تک تھیں اور پاکستان سے آج بھی ان لوگوں کا کوئی
تعلق نہیں ہے جو اس زمین اور اس زمین پر بسنے والے لوگوں کے عقیدے سے
الرجک ہیں۔ شہباز ملک اگرچہ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں' لیکن ان کا بچپن بھی تھڑوں
پر گزرا ہے۔ سو پنجابی کے جن شاعروں نے تحریکِ پاکستان میں اپنی شعلہ نوائی سے
مسلم عوام کے دلوں میں آگ لگا دی' ان عظیم لوگوں کا تذکرہ بھی اسی شخص نے
محفوظ کرنا تھا جس کا بچپن تھڑوں اور جوانی اکھاڑوں میں گزری ہے!

کلام بلاغت اور نظام

یہ اس وقت کی بات ہے جب مَیں ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن میں ۸ ویں ۹ ویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ مجھ سے ایک کلاس سینئر ایک دوست نے صبح اسمبلی کے وقت ہیڈ ماسٹر سمیت تمام اساتذہ سے ڈھیروں داد وصول کی۔ یہ غالباً کوئی خاص OCASSION تھا اور میرے اس دوست نے موقع کی مناسبت سے ایک نظم پڑھی جس پر تمام اساتذہ نے اسے کھل کر داد دی اور میرے ایسے طالب علم جو ادب سے تھوڑا بہت "ٹھرک" اس وقت بھی رکھتے تھے۔ بہت مرعوب ہوئے۔ ہمیں یہ تو اندازہ تھا کہ ہمارا یہ دوست ادب سے خاصی مناسبت رکھتا ہے، لیکن اس امر کا اندازہ ہمیں قطعاً نہیں تھا کہ وہ اس قدر قادر الکلام بھی ہے کہ اپنے کلام سے دلوں میں ایک عجیب طرح کا ولولہ اور جوش پیدا کر دے۔ اسمبلی کے بعد ہم تمام دوست اس کے پاس گئے اور اس روز خاصے مؤدب ہو کر اس کے پاس کھڑے رہے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے اسے داد دی کہ خدا جانے ہم ہیچمدانوں کی داد یہ حضرت قبول بھی فرماتے ہیں یا نہیں، مگر شخص مذکور نے کمال انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ بار بار ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے خالص شاعرانہ انداز میں ہماری داد کی رسید دی بلکہ یہ بھی فرمایا کہ شعر وغیرہ کے معاملے میں اگر کبھی کوئی الجھن ہو تو چلے آیا کرو، اس میں جھجکنے کی کوئی بات نہیں، کیونکہ فن کسی کی میراث نہیں ہوتا، چنانچہ ہم سب

دوستوں نے اسے استادِ فن تسلیم کیا اور آج تک کرتے ہیں، کیونکہ بعد میں یہ پتہ چلا کہ وہ نظم نعیم صدیقی کی تھی اور اس دوست نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ فن کسی کی میراث نہیں ہوتا!

تاہم مَیں اپنے اس دوست کا بے حد ممنون ہوں کہ مَیں نے پہلی دفعہ نعیم صدیقی کی نظم اس کے حوالے سے سُنی، لیکن یہ ممنونیت بس یہیں تک ہے کیونکہ اس کے کافی عرصے بعد ایک ادبی جریدہ "مستقبل" کے نام سے مَیں نے اباجی کی لائبریری میں دیکھا جس کی حیثیت دینی کتابوں سے بھری ہوئی لائبریری کے سمندر میں ایک جزیرے کی سی تھی، یہ بہت خوبصورت پرچہ تھا، اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے میری نظر نعیم صدیقی ہی کی ایک نظم پر رک گئی اور اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود یہ نظم آج بھی زبانی یاد ہے اس کے شروع کے بند کچھ یوں تھے۔

ہم لوگ اقراری مجرم ہیں
سن اے جبّاری مجرم ہیں
حق گوئی بھی ہے جرم کوئی
تو ہم پھر بھاری مجرم ہیں
روپوش نہیں، مفرور نہیں
پھر ہم کو جوابِ دعویٰ ہیں
کچھ کہنا بھی منظور نہیں

تعزیر کو ہم خود حاضر ہیں
ہم لوگ اقراری مجرم ہیں

مجھے یہ نظم اپنی موسیقیت اور روایت سے ذرا ہٹ کر ہونے کے علاوہ

اس لیے بھی یاد رہ گئی ہے کہ اس میں جبر کے خلاف وہ للکار اور تاثیر موجود تھی جو صرف (CONVICTION) اور شعری تجربے کے راسخ ہونے ہی کی صورت میں وجود میں آتی ہے اور خون کو "ہلارے" دینے لگتی ہے جب کہ نیشن اپیل تحریکی شاعری تو ایسی شاعری ہے کہ جسے سنتے ہوئے مونچھیں مروڑ مروڑ کر "مولاداد" بھی داد دیتا ہے۔

آج جب کہ نعیم صدیقی کو پڑھتے پڑھتے ان کے بارے میں کچھ لکھنے کی عمر تک پہنچا ہوں، "تو وہ سورج بن کر ابھرے گا" کی صورت میں نعیم صدیقی کی اکیس نظموں کا مجموعہ میرے سامنے ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے لیے ان کا شعری خراج ہے اور یوں ان اکیس نظموں کی صورت میں شاعر نے دراصل مولانا کو اکیس توپوں کی سلامی دی ہے۔ گو اس مجموعے کی نظمیں مولانا کی شخصیت اور ان کے افکار سے شدید (INVOLVEMENT) کی مظہر ہیں مگر شاعر نے اپنے ہونے کا پتہ یہاں بھی دیا ہے، چنانچہ وہ شدتِ جذبات میں پروزیک (PROSAIC) نہیں ہوا، بلکہ اس چیز نے الٹا اس کی شاعری کو مہمیز دی ہے جبکہ ایسے مواقع پر اس امر کا امکان موجود ہوتا ہے کہ شاعر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنے محبوب کو بھرپور خراجِ عقیدت تو پیش کر لے، مگر اس عمل کے دوران بے زبان شاعری پر اتنا بوجھ ڈال دے کہ بعد میں اس عفیفہ سے اسے معذرت کرنا پڑے۔ نعیم صدیقی کو اس مرحلے سے نہیں گزرنا پڑا انہوں نے ان نظموں میں اپنا سینہ چیر کر رکھ دیا ہے، مگر شاعری کو "پھٹ" نہیں لگنے دیا۔ اس مجموعے کی سب سے خوبصورت نظم "شاہ بلوط" ہے جو پہاڑ سے پھوٹتے ہوئے چشمے کی طرح ولولہ انگیز اور مترنم ہے۔ نعیم صدیقی کی شاعری پُرشور جذبے کی اس

تہذیب ہی سے ترتیب پائی ہے اور اب یہی ان کا فن ٹھہرا ہے اور جیسا کہ مَیں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس طرح کی شاعری صرف CONVICTION اور شعری تجربے کے راسخ ہونے کی صورت میں وجود میں آتی ہے۔ وگرنہ ہمارے ہاں ایسے بہت سے نظریاتی شاعر موجود ہیں جن کا کلام بلاغت نظام پڑھتے ہوئے کلام، بلاغت اور نظام تینوں سے ایمان اٹھ جاتا ہے!

مجازِ مُرسل

سرور مجاز کے ساتھ میری نشستیں بہت کم ہوئی ہیں۔ تین چار بار ٹی ہاؤس میں ان کے ساتھ گپ شپ کا موقع ملا ہے مگر کچھ یوں کہ "مرد ماں بسیار" والی صورت حال تھی اور دو چار دفعہ ان کے دفتر میں ان سے ملا ہوں مگر یہاں بھی خلوتِ صحیحہ میسر نہیں آسکی، البتہ ایک دفعہ سرور مجاز کے ساتھ کھل کر بات چیت کا موقع ملا اور یہ موقع وہ تھا جب وہ میرے دفتر میں آئے۔ ان ملاقاتوں کے دوران سرور مجاز کچھ اتنی محبت کا ثبوت دیتے رہے ہیں اور ان کی گفتگو میں کچھ اتنی مٹھاس رہی ہے کہ ان ملاقاتوں کے اگلے روز جب وہ اپنی ادبی ڈائری میں کوئی فقرہ مارتے ، تو میں ان کی شیریں لبی کو یاد کرتا تھا اور بے مزا نہیں ہوتا تھا!

ان ملاقاتوں کے علاوہ ملاقاتوں کا ایک سلسلہ وہ ہے جو صرف "ہیلو ہیلو" تک محدود رہتا ہے۔ یہ صورت ادبی محفلوں کے اجلاس میں پیدا ہوتی رہی ہے۔ سرور مجاز سفید کھدر کا کرتا اور سفید کھدر کا پاجامہ پہنے ایک ہاتھ میں گولڈ لیف کا پیکٹ اور دوسرے ہاتھ میں بہی کھاتے جیسی ایک ڈائری تھامے کسی کونے کھدرے میں کھڑے ہوتے ہیں کہ وہ لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلتے ہوئے اپنے لیے اگلی صف میں نشست حاصل کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ میں بھی اس سفید پوش کے گرد و نواح میں کہیں کھڑا ہوتا ہوں۔ ہماری آنکھیں چار ہوتی ہیں اور اشاروں کنایوں میں سلام دعا

کے بعد محفل کے اختتام پر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ بڑے پیار سے مجھے "شاہ جی" کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ اور کچھ اس طرح حال احوال پوچھتے ہیں کہ بقول شاعر ؎

کچھ اس ادا سے آپ نے پوچھا مزاج
کتنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

اس موقع پر میں شکرِ پروردگار اس لیے بھی ادا کرتا ہوں کہ پورے شہر میں سرور مجاز واحد جوہر شناس ہے جو مجھے "شاہ جی" کہتا ہے اور میں بھی اس کی تردید کرنے کے بجائے مچلا مار جاتا ہوں کہ میرا کیا جاتا ہے۔ قیامت کے روز فرشتے خود ہی اس سے نمٹ لیں گے۔ میرے ایک دوست کے بارے میں خالد احمد کا کہنا ہے کہ وہ "سیلف میڈ" انسان ہے، حتیٰ کہ سید بھی وہ خود ہی بنا ہے۔ "سیلف میڈ" تو میں بھی ہوں، بس سید کہلاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ سید کہلانا شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے!

سرور مجاز کے بارے میں، میں نے آغاز میں بتایا تھا کہ ان کے ساتھ میری نشستیں بہت کم رہی ہیں، مگر میں نے غالباً یہ نہیں بتایا کہ ان کی شاعری کے ساتھ میری آشنائی بہت پرانی ہے۔ یوں میں جانتا ہوں کہ سرور مجاز کا سرمایہ ان کی یہ اردو غزلیں ہی نہیں ہیں بلکہ وہ اس سے بہت پہلے ایک طویل عرصے پنجابی کے صوفی شعرا کو اردو کے قالب میں ڈھالنے میں مشغول ہیں۔ میں نے اس کے کچھ حصے دیکھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ کام ایک ادبی کارنامے ہی کے ذیل میں نہیں آتا بلکہ ایک بہت بڑی قومی خدمت ہے۔ اردو اور پنجابی سوکنیں نہیں ہیں کہ یہ ایک دوسرے کے بال نوچتی رہیں بلکہ ان میں جو رشتہ ہے وہ اِک مِک ہونے کا رشتہ ہے۔ سرور مجاز ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے کلام

سے ان دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب بلکہ عنقریب لا رہے ہیں سرور مجاز
تو اس کام میں جُتے ہی ہوئے ہیں، ہمیں بھی اپنے ادبی گناہوں کا کفارہ ادا
کرنے کے لیے اس قسم کا کوئی نیک کام کرنا چاہیے۔

اور ان سطور سے کوئی صاحب (یا صاحبہ) یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہ فرمائیں
کہ میں سرور مجاز کی اردو شاعری کے بارے میں کچھ کہنے سے کترا رہا ہوں۔ میں نے "شہر آشنا"
حرف بحرف پڑھی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجاز کی شاعری دراصل مجازِ مرسل
کی شاعری ہے، میں ان دنوں فرسٹ ایئر کے طلبہ کو گرامر پڑھا رہا ہوں، میں نے
انہیں ابھی کل ہی مجازِ مرسل کی تعریف لکھائی ہے جس کے مطابق جب کوئی لفظ اپنے
حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال کیا جائے اور اس کے حقیقی اور مجازی
معنوں کا تعلق تشبیہہ کے علاوہ کوئی اور ہو تو اسے مجازِ مرسل کہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں
بلکہ اس مجازِ مُرسل کی نو صورتیں ہیں (۱) سبب بول کر مسبّب مراد لینا (۲) مسبب
بول کر سبب مراد لینا (۳) کُل بول کر جُزو مراد لینا (۴) جزو بول کر کل مراد لینا (۵) ظرف
بول کر مظروف مراد لینا (۶) مظروف بول کر ظرف مراد لینا (۷) کسی شے کے واسطے
کا ذکر کر کے خود وہ شے مراد لینا (۸) ماضی کی حالت بول کر موجودہ حالت مراد لینا (۹)
موجودہ حالت بول کر مستقبل کی حالت مراد لینا!

مجازِ مرسل کی تمام صورتوں کی مثالیں گرامر کی کتاب میں بھی موجود ہیں اور مجاز کے
"شہر آشنا" میں بھی جا بجا ملتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو آپ بھی "شہر آشنا" سے گزر کر
دیکھیں اور اس حیرت سے دوچار ہوں جس سے میں دوچار ہوا ہوں اور مقامِ حیرت
یہی ہے کہ سرور مجاز جو اپنی گفتگو بلکہ وضع قطع میں غزل کی پرانی روایت کے طرف دار
لگتے ہیں اور یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید وہ غزل میں :

پان لگ لگ کے مری جان کدھر جاتے ہیں
یہ مرے قتل کے سامان کدھر جاتے ہیں

ایسے مضامین باندھنے کے قائل ہوں گے۔ جب غزل کہنے بیٹھتے ہیں تو وہاں کُل بول کر جُزو مراد لیتے ہیں اور جزو بول کر کل مراد لیتے ہیں۔ وہ ماضی کی حالت بول کر موجودہ حالت اور موجودہ حالت بول کر مستقبل کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ سو میں تو آخر میں بھی مجاز کی شاعری کو مجازِ مرسل کی شاعری کہوں گا۔" کر لو جو کرنا ہے۔"

پرولتاری بورژوا

رفیق ڈوگر سے میری ملاقات قریباً چار پانچ سال قبل مجیب الرحمٰن شامی کے دفتر میں ہوئی تھی۔ شامی اس وقت زندگی، اداکار، اذانِ حق یا لیل و نہار وغیرہ میں سے کسی ایک پرچے کا ایڈیٹر تھا۔ شامی سے دورانِ گفتگو میری نظر رفیق ڈوگر پر پڑی۔ میں نے اس کے کالم تو پڑھے تھے، مگر چہرے سے شناسا نہیں تھا، سو میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ اس کی شکل و صورت اور لب و لہجہ خالص جٹوں جیسا تھا میں سمجھا کہ شاید یہ مجیب الرحمٰن شامی کا کوئی عقیدت مند ہے جو گاؤں سے اس کے لیے مرونڈے لے کر آیا ہے، لیکن شامی نے کچھ ہی دیر بعد میری یہ غلط فہمی دور کر دی۔ اس نے دیہاتی وضع قطع کے حامل اس شخص سے میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ موصوف رفیق ڈوگر ہیں۔ ظاہر ہے میرے لیے یہ امر باعثِ مسرت تھا کہ جس شخص کی تحریریں ذوق و شوق سے پڑھتا رہا ہوں وہ اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہے۔ سو میں نے گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر وہ ہمارے ساتھ گپ شپ میں شریک ہو گیا۔ رفیق ڈوگر نے مجھ سے "فنون" میں قسط وار شائع ہونے والے میرے سفرنامے کے بارے میں پوچھا کہ وہ کتابی صورت میں کب آ رہا ہے؟ میں نے اس وقت بھی اسی حتمی انداز میں جواب دیا کہ بس ایک دو ماہ تک چھپ جائے گا جس طرح آج پانچ سال گزرنے کے بعد بھی اپنے دوستوں کو اس سوال کا جواب حتمی انداز میں دیتا ہوں۔ تذکرہ

ملاقات میں اس سے گفتگو دو چار جملوں تک ہی محدود رہی۔

رفیق ڈوگر سے میری دوسری ملاقات "نوائے وقت" کے دفتر کے باہر ہوئی۔ اس نے دھوتی پہنی ہوئی تھی اور وہ بشریٰ بیوٹی کلینک کی طرف جا رہا تھا۔ دھوتی پہن کر بیوٹی کلینک جانا میری سمجھ میں نہ آیا، مگر پھر سمجھ میں آ گیا۔ کوئینز روڈ پر واقع کوٹھی کے ایک حصے میں جماعت اسلامی کا دفتر ہے اور اس کی بغل میں بشریٰ بیوٹی کلینک ہے جہاں بُت طناز اپنے حسن کے مزید نکھار کے لیے آتے ہیں، گویا اقبال نے ٹھیک کہا تھا ؎

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں ...

سو رفیق ڈوگر اسی عمارت کی طرف جا رہا تھا جس کی چھت پر واقع برساتی اس کا گھر تھی اور آج بھی یہی برساتی اس کی جائے پناہ ہے، ایسی جائے پناہ جو گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہروں میں اسے سورج سے امان نہیں دیتی اور یخ بستہ سردیوں میں اس کے ہاتھ پاؤں کے تلووں کے پاس حرارت نہیں پھٹکنے دیتی۔ پھر کرنا خدا کا یہ بھی ہوا کہ وہ میرا بے تکلف دوست بھی بن گیا، چنانچہ ایک طرف وہ ہائی کورٹ کی رپورٹنگ کرتا تھا، دوسری طرف "دید شنید" لکھتا تھا اور تیسری طرف آتے جاتے میرے ساتھ ٹھگریں کرتا تھا۔

رفیق ڈوگر کے بارے میں مجھے جانے کیا لکھنا تھا، مگر قلم ہاتھوں میں تھامتے ہی میرا طبقاتی شعور اچانک بیدار ہو گیا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ وہ حال ہی میں سولہ سو ایکڑ سکیم میں واقع ڈوگر پیلس کا مالک بن گیا ہے۔ یہ ڈوگر پیلس جس کی کھڑکیاں اور دروازے وغیرہ فی الحال نامکمل ہیں پورے پانچ مرلے میں واقع ہے۔ رفیق ڈوگر نے صحافیوں کی کالونی میں واقع یہ پلاٹ قسطوں میں خریدا اور اب وہ ہاؤس بلڈنگ

فنانس کارپوریشن سے قرض لے کر اس کی تکمیل میں مشغول ہے؛ چنانچہ دوسرے بڑے سرمایہ داروں کی طرح اب اس کا رواں رواں بھی قرضے میں پھنسا ہوا ہے۔ میں ان دنوں اپنے جیسے کچھ لامکان لوگوں کو منظم کر کے رفیق ڈوگر کے پیلس کے سامنے ایک عظیم الشان مظاہرہ کرنے کی سوچ رہا ہوں اور انہیں روز و شب اقبال کی اس نظم کا گھوٹا لگواتا ہوں، جس کا مطلع ہے:

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

مگر رفیق ڈوگر بڑا باخبر اور کائیاں رپورٹر ہے۔ اسے غالباً میرے منصوبے کا علم ہو گیا ہے؛ چنانچہ وہ بشریٰ بیوٹی کلینک اور جماعتِ اسلامی کے دفتر کی مشترکہ چھت پر واقع اس کمرے سے ڈوگر پیلس منتقل ہونے کا نام ہی نہیں لیتا جس میں ایک چارپائی اور فرش پر کتابوں، رسالوں کا ڈھیر ہے۔ رفیق ڈوگر کا یہ کمرہ رفیق ڈوگر ہی کی طرح سردیوں میں ایئر کنڈیشنڈ اور گرمیوں میں سنٹرلی ہیٹڈ ہوتا ہے۔ ڈوگر برسات میں کمرے سے نکلے بغیر "نائیاں مائیاں" بھی کر لیتا ہے۔ بس ایک موسم بہار ایسا ہے جس میں یہ کمرہ عام کمروں کی صفات اپنے اندر رکھتا ہے، مگر موسمِ بہار کب آئے گا؟ موسمِ بہار کب آئے گا؟ اس کی جگہ یہ بھی پوچھ سکتا تھا کہ بہار کب آئے گی؛ مگر اس سے دھیان خواہ مخواہ اداکارہ بہار کی طرف چلا جاتا ہے اور میرا نام عطاء الحق قاسمی ہے افضال چیتا نہیں۔ رفیق ڈوگر بھی میری طرح شریف آدمی ہے؛ چنانچہ وہ بھی اہلِ سیاست سے گاہے بگاہے یہی پوچھتا ہے کہ موسمِ بہار کب آئے گا؛ مگر چونکہ وہ شریف آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ پینڈو بھی ہے؛ لہٰذا یہ سوال کرتے وقت اس نے موڈھے پر ڈانگ بھی رکھی ہوتی ہے۔ رفیق ڈوگر صحافت کی کمانڈو فورس ہے اور

اس کمانڈو نے ماضی میں شاندار فتوحات حاصل کی ہیں۔

تاہم یہ کمانڈو فورس والا حوالہ "دید شنید" کے کالم نگار رفیق ڈوگر کے سلسلے میں ہے، جبکہ "چالیس چہرے" والا رفیق ڈوگر ایک سیاسی چھاپہ مار سے زیادہ ایک ادیب کی صورت میں ظاہر ہُوا۔ مثلاً مَیں تھوڑی دیر کے لیے خود پر سنجیدگی طاری کرنے کی کوشش کروں، تو یہ بتا سکوں گا کہ اردو میں فرحت اللہ بیگ، سعادت حسن منٹو، مولوی عبدالحق، عصمت چغتائی، رشید احمد صدیقی، محمد طفیل، احمد بشیر اور اب گلزار وفا چودھری نے جو خاکے لکھے ہیں، وہ بیشتر ادبی شخصیتوں کے ہیں، جبکہ رفیق ڈوگر نے اس کتاب میں چالیس سیاسی شخصیتوں کے چہروں سے نقاب سرکایا ہے۔ یہ قدرے زیادہ مشکل کام تھا، کیونکہ سیاست والوں کے ایک نہیں کئی چہرے ہوتے ہیں۔ چند ایک کو چھوڑ کر بیشتر سیاستدانوں کا چہرہ اُس بدصورت عورت سا ہوتا ہے جس نے غازے کی تہوں سے اسے جاذبِ نظر بنانے کی کوشش کی ہوتی ہے۔ رفیق ڈوگر نے بھی یہ کیا ہے کہ ان چہروں پر سے غازہ اتار دیا ہے اور پھر کاغذ پر ان کے لفظی کارٹون بنا دیے ہیں، لیکن اس نے یہ کام چونکہ پوری ہنرمندی سے کیا ہے، اس لیے اگر کوئی اس سے اتفاق نہیں بھی کرتا، تو اس کی ہنرمندی کی داد ضرور دیتا ہے ان داد دینے والوں میں غالباً بدصورت چہروں والے سیاستدان بھی شامل ہوں گے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ سیاستدان ہیں اور دوسرے اس لیے کہ رفیق ڈوگر نے ان کے غازے بے دردی سے کھرچے نہیں، بڑے پیار سے اتارے ہیں۔

مگر مجھے تو یہ توصیفی جملہ لکھتے ہوئے پھر یاد آیا ہے کہ رفیق ڈوگر

کے ساتھ حال ہی میں میرا طبقاتی اختلاف پیدا ہُوا ہے اور مَیں تو پورے پانچ مرلے میں واقع اس کے ڈوگر پیلس کے سامنے ایک عظیم الشان مظاہرے کا

منصوبہ ترتیب دے رہا ہوں، لہذا اس کے بارے میں میں نے اگر کوئی تعریفی جملے کہے ہیں، تو ان جملوں کے جملہ حقوق واپس لیتا ہوں۔ میں پرولتاری ہوں، رفیق ڈوگر بورژوا ہے۔ جب تک میرا زیر تعمیر مکان مکمل نہیں ہو جاتا، اس وقت تک اس کے ساتھ کوئی اتحاد نہیں ہو سکتا۔

سیاہ گاؤن

حفیظ صدیقی سے میری ملاقات روزانہ ہوتی ہے۔ وہ سیاہ گاؤن پہنے، رجسٹر ہاتھوں میں پکڑے، کلاس میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں۔ میں سیاہ گاؤن پہنے رجسٹر ہاتھوں میں پکڑے، کلاس سے نکل رہا ہوتا ہوں۔ مجھ میں، ان میں "اتفاق" کے علاوہ کچھ "اختلاف" بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ عینک لگاتے ہیں میں نہیں لگاتا۔ وہ دبلے پتلے اور نحیف و نزار سے شخص ہیں۔ کسی نے ان کا کلام نہ بھی پڑھا ہو وہ انہیں شاعر تسلیم کرلے گا۔ میں نحیف و نزار نہیں ہوں، چنانچہ کسی نے میرا کلام پڑھا بھی ہو وہ مجھے شاعر نہیں مانے گا۔ سخن فہمی اسی کو کہتے ہیں۔

حفیظ صدیقی سے میری ملاقات ان کے کلاس سے نکلنے اور داخل ہونے وقت ہی نہیں، اس کے بعد یونس احقر کے کمرے میں بھی ہوتی ہے، جہاں احمد حسن حامد، تحسین فراقی، طفیل دارا اور عارف عبدالمتین بھی گاہے گاہے جمع ہو جاتے ہیں۔ یہاں خالی پیریڈ میں چائے کے کپ پر گپ ہوتی ہے۔ حفیظ صدیقی سگریٹ پر سگریٹ سلگائے چلے جاتے ہیں۔ خود بات کم کرتے ہیں، لیکن ہمہ تن گوش نظر آتے ہیں۔ خصوصاً طفیل دارا کی علمی بحثیں بڑی توجہ سے سنتے ہیں۔ بس کہیں بیچ میں چپکے سے ایک جملہ جڑ دیتے اور پھر سگریٹ سلگا کر اس جملے کے مابعد اثرات بغور ملاحظہ فرماتے ہیں۔ حفیظ صدیقی دیکھنے میں خاصے آدم بیزار قسم

کے شخص ہیں، لیکن ان سے زیادہ شگفتہ جملہ دوستوں میں شاید کوئی بھی کہنا نہیں جانتا، یعنی تھوڑا بولتے ہیں پر ستھرا بولتے ہیں! بس اس کے لیے ان کے سامنے ایک کپ چائے، ایک ڈبیہ سگریٹ اور ایک شریف النّفس سا ہدف ہونا چاہیے!

سیاہ گاؤن پہنے، رجسٹر ہاتھوں میں لیے کسی کلاس میں داخل ہوتے یا نکلتے وقت حفیظ صدیقی کبھی دھیمے سے اپنا ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھ دیتے ہیں اور ہولے سے پوچھتے ہیں "آج آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔ کچھ وقت ہوگا؟" خدا کا شکر ہے کہ ایسے مواقع پر آس پاس کوئی نہیں ہوتا، ورنہ حفیظ صدیقی کے اندازِ پرسش کے طفیل ہم دونوں میں سے کوئی بھی شہر میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ بہرحال میں اثبات میں سر ہلاتا ہوں اور پیریڈ کے بعد ہم دونوں کالج گیٹ کے ساتھ واقع کنٹین میں جا بیٹھتے ہیں۔ حفیظ صدیقی دھیمے لہجے میں بات کا آغاز کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ اپنے پوائنٹ کو ایکسپینڈ کرتے چلے جاتے ہیں میں اس سارے عرصے کے دوران سسپنس میں مبتلا رہتا ہوں کہ خدا جانے کون سی ایسی بات ہے جس کے لیے حفیظ صدیقی نے اتنی تمہید باندھی ہے۔ اس دوران میں مجھے یوں لگتا ہے جیسے الفرڈ ہچکاک کی کوئی فلم دیکھ رہا ہوں۔ سسپنس کا یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹتا ہے جب حفیظ صدیقی اپنی بات مکمل کر لیتے ہیں اور بات یہ ہوتی ہے کہ کل دورانِ گفتگو انہوں نے جو فقرہ کہا تھا اُس کا سیاق و سباق یہ تھا، اس کا روئے سخن فلاں کی طرف تھا اور یہ کہ آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور آپ کو اپنا عزیز دوست سمجھتا ہوں۔ ان لمحوں میں مجھ پر منکشف ہوتا ہے کہ حفیظ صدیقی دوستوں کے معاملے میں حد درجہ محتاط ہیں۔ انہیں آبگینے سمجھتے ہیں اور ان آبگینوں کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دیتے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دنوں پاکستان آرٹسٹس ایکویٹی کے الیکشن میں جب ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی، تو حفیظ صدیقی کے بکس میں سے دونوں پارٹیوں کے ووٹ برآمد ہوئے۔

لیکن یہ شگفتہ جملے کہنے والا، دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرنے والا اور بھاری اکثریت سے الیکشن جیتنے والا حفیظ صدیقی مکمل حفیظ صدیقی نہیں ہے ایک حفیظ صدیقی اس کے علاوہ بھی ہے اور یہ حفیظ صدیقی ایک تنہا اور اداس شخص ہے۔

یہ شاعر حفیظ صدیقی ہے جو ایک لمحے خواب دیکھتا ہے اور دوسرے لمحے شکستِ خواب سے دوچار ہو جاتا ہے، اپنے اردگرد منافقتوں اور غلاظتوں کے ڈھیر دیکھ کر تلملاتا ہے! چہروں پر کندہ غربت اور افلاس کی تحریریں پڑھتا ہے۔ وطن دشمنوں کو وطن کی مقدس خاک پر دندناتے دیکھتا ہے اور تڑپ تڑپ جاتا ہے۔ تنہائی کے بوجھ میں دبا ہوا حفیظ صدیقی اپنے نام خود خط لکھتا ہے اور پھر خود ہی وصول پاتا ہے۔

"لموں کی آگ" میں جو حفیظ صدیقی نظر آتا ہے، وہ یہی حفیظ صدیقی ہے جس نے ماتمی لباس پہنا ہوا ہے اور جس کے لفظ گریہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ حفیظ صدیقی وہی ہے جس نے سیاہ گاؤن پہنا ہوتا ہے اور کلاس سے نکلتے یا داخل ہوتے وقت جس سے روزانہ میری ملاقات ہوتی ہے۔

ایک غیر شاعر، شاعر

گو عبدالعزیز خالد کے اتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جتنی ابھی تک میری غزلیں بھی شائع نہیں ہوئیں، مگر اس کے باوجود میں انہیں شاعر نہیں مانتا میری ہی طرح کے کچھ اور لوگ بھی انہیں شاعر نہیں مانتے، مگر ان کے مسائل کچھ اور ہیں، جبکہ مَیں انہیں اگر طبقۂ شعرا میں شامل نہیں سمجھتا، تو میرے پاس اس کے لیے قدرے مختلف دلائل و براہین موجود ہیں۔ مثلاً مَیں سمجھتا ہوں کہ شاعر ایسے نہیں ہوتے جیسے اپنے عبدالعزیز خالد ہیں۔ شاعر ہونے کے لیے جن کم سے کم شرائط کا پورا ہونا لازمی ہے ان میں ایک "تلمیذالرحمٰن" ہونے کی شرط بھی ہے ــــــ بھلے وقتوں میں تو اس تلمیذالرحمٰن کے معنی بھی کچھ بھلے سے ہوں گے مگر آج کل اس کا مطلب علم سے کورا ہونا ہے، لکھنے پڑھنے سے الرجک ہونا ہے اور جب کوئی اس اہم فریضے کی طرف توجہ دلائے، تو آگے سے ناک بھوں چڑھا کر یہ کہنا ہے کہ صاحب ہمیں پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت ہے ہم تو تلمیذالرحمٰن ہیں۔ یہ علحدہ بات ہے کہ جب اس تلمیذالرحمٰن سے دو چار بار سابقہ پڑتا ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تلمیذالرحمٰن دراصل گوالمنڈی کا عبدالرحمٰن ہے۔ سو عبدالعزیز خالد کو اگر مَیں شاعر نہیں مانتا، تو اس کی پہلی وجہ یہی ہے کہ وہ عبدالرحمٰن کیوں نہیں ہیں؟ یہی نہیں انہیں تو جنون کی حد تک مطالعے کا شوق ہے اور نہ صرف یہ کہ ان کی ذاتی کتابوں

یا یوں کہہ لیں کہ ان کی "منکوحہ" کتابوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہوئی ہے بلکہ وہ دوسروں کی کتابوں پر بھی ہر وقت دندانِ آز تیز رکھتے ہیں اور انہیں اپنے "حرم" میں شامل کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں، چنانچہ کسی کے ہاتھ میں کوئی نئی نویلی کتاب دیکھ کر ان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور پھر وہ اس کے حصول کے لیے بے چین نظر آنے لگتے ہیں۔ انہیں شاعر نہ ماننے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا حُلیہ اور عادتیں شاعروں جیسی نہیں ہیں، چنانچہ انہیں دیکھ کر نہ تو بچے ڈرتے ہیں اور نہ بچوں کی ماں کے دل میں وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح شاعر ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ دنیاداری کے جھمیلوں میں نہ پڑتا ہو، یعنی اسے اپنے اور بال بچوں کی روزی کمانے کے لیے محنت و مشقت کی عادت نہ ہو، بلکہ اس ضمن میں وہ تین سو غزل ماہوار آمدنی ہی کو کافی سمجھتا ہو۔ بدقسمتی سے عبدالعزیز خالد یہ شرط بھی پوری نہیں کرتے، ورنہ میں انہیں رعایتی نمبر دے کر ہی شاعر مان لیتا۔ عبدالعزیز خالد میں ایک چیز ایسی بھی ہے جو اُن کے ہم رتبہ اور ان کے "ہم رینک" بیشتر فنکاروں میں نہیں پائی جاتی، مگر ان میں موجود ہے اور یہ سچّی خوش خلقی ہے۔ راقم الحروف نے عمرِ عزیز کے کئی برس انہی لوگوں میں بسر کیے ہیں اور یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں کہ جب کوئی ادیب نامور ہو جاتا ہے تو وہ کبھی اندر ہی اندر اور کبھی کھلم کھلا دوسروں کو حقیر کیڑے مکوڑے تصوّر کرنے لگتا ہے، چنانچہ اس قبیلے کے افراد جب نئی نسل کے ادیب کے ساتھ ملتے ہیں تو اس کی تخلیقات سے کماحقّہٗ آگاہی کے باوجود پائپ کو دانتوں میں چباتے اور غور و فکر کے لیے آنکھیں موندتے ہوئے کہتے ہیں "میں نے آپ کا نام کہیں پڑھا ہے!" یہ سُن کر آپ کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور آپ چُپ چاپ وہاں سے اُٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے ایک بھلے مانس

دوست کا کہنا ہے کہ یہ لوگ دوسروں کی تخلیقات سے بے خبری کا یہ انداز "پوز" نہیں کرتے، بلکہ درحقیقت انھوں نے مطالعے جیسی عادتِ بد پالی ہی نہیں ہوتی؛ چنانچہ ایسا نہیں کہ یہ صرف دوسروں کی چیزیں نہیں پڑھتے؛ بلکہ یہ کوشش کے باوجود اپنی تخلیقات بھی نہیں پڑھ سکتے؛ تاہم اسی طرح کے ایک بڑے افسانہ نگار سے میری بھی ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر بکھیری اور کہا: "آپ کے کچھ کالم والم مَیں نے پڑھے ہیں اور آپ کہیں باہر واہر بھی تو گئے تھے"۔ مَیں نے یہ سن کر اثبات میں سر ہلایا اور پھر کچھ وقفے کے بعد اس افسانہ نگار سے کہا: "ایک عرصے سے آپ کی کوئی 'غزل' نظر سے نہیں گزری، آپ ایسے شاعر کو اتنی طویل خاموشی اختیار نہیں کرنی چاہیے"۔ تاہم عبدالعزیز خالد سے ہمکلام ہوتے وقت اس نوع کے جوابی حملوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، کیونکہ ان سے ملاقات کے وقت مصنوعی مسکراہٹ کے بجائے سچی گرمجوشی میسر آتی ہے اور دوسرے آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ دورانِ گفتگو اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے آپ کو کمتر ثابت کرنے کی کوششوں میں مشغول نہیں ہیں، بلکہ اس ملاقات کے دوران آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ ان کی رسائی آپ کے ایک ایک چھپے ہوئے لفظ تک ہو چکی ہے، بلکہ آپ اپنی جن تحریروں کو بھول بھی چکے ہیں یا بھلانا چاہتے ہیں۔ عبدالعزیز خالد گفتگو میں ان کا حوالہ دینے سے بھی نہیں چوکیں گے؛ چنانچہ وہ آپ کو سنجیدگی سے بتائیں گے کہ "ممتاز عالم جنتری میں آپ کی غزل نظروں سے گزری تھی۔ ماہنامہ چاند کے کچھ پرچے ایک جگہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، تو آپ کے مزاحیہ مضامین پڑھنے کو ملے۔ بہت اچھے تھے، بہت اچھے تھے، بہت اچھے تھے"۔

یہ "بہت اچھے بھتے" کی گردان کتابت کی غلطی نہیں ہے، بلکہ نقل بمطابق اصل ہے، کیونکہ عبدالعزیز خالد گفتگو کے دوران قدرے ہکلاتے ہیں مگر اس کا حل انہوں نے یہ سوچا ہے کہ جس فقرے پر ہکلانے لگیں، تو فوراً وہ فقرہ تیزی سے دہرانے لگتے ہیں، یوں وہ عام گفتگو بھی بہت تیزی سے کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، حتیٰ کہ مشاعرے میں اپنا کلام پڑھتے وقت بھی ان کی سپیڈ اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ اٹھارواں شعر پڑھ رہے ہوتے ہیں، تو سامعین ابھی آٹھویں شعر ہی پر داد دینے میں مشغول ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں ایک بار مشورہ دیا کہ وہ اشعار سناتے وقت رفتار ذرا آہستہ رکھا کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے میری بات مان لی، چنانچہ اب ان کے کلام اور سامعین کی داد میں صرف تین چار شعروں ہی کا فاصلہ رہ گیا ہے۔

عبدالعزیز خالد یہ فاصلہ اپنے اور شاعروں کے سامعین ہی کے مابین نہیں کچھ اور مواقع پر بھی برقرار رکھتے ہیں۔ شاعر ہونے کے ناطے سے میں نے انہیں شاعرات یا غیر شاعرات سے ہنستے بولتے تو دیکھا ہے، مگر اس کے آگے وہ غالباً فاصلے ہی فاصلے کے قائل ہیں۔ یہ غالباً کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ غیب کا علم تو خدا ہی کو ہے، سو میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ دفتر میں بیٹھے ہوئے انہوں نے ایک ملائم ٹیلی فون کال ریسیو کی اور پھر ہنسنے بولنے کا عمل شروع ہو گیا۔ اپنی بات ابھی پوری کرتا ہوں۔ پہلے آپ کو یہ بتاؤں کہ خالد کی گفتگو میں علم کی چاشنی حد درجہ ہوتی ہے اور وہ ہلکی پھلکی گفتگو میں بھی پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ تمام گرہیں ایک ایک کرکے کھلتی محسوس ہوتی ہیں؛ چنانچہ انسان ان کے پاس بیٹھ کر کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی ہے،

گنواتا کچھ نہیں؛ تاہم اس روز مجھے پہلی بار ان کی علمی گفتگو بے موقع لگی، کیونکہ دوسری طرف "بہاریہ" گفتگو ہو رہی تھی۔ اپنے خالد صاحب ماشاءاللہ گریجوایٹ ہیں اور وہ خاتون بھی یقیناً گریجوایٹ ہوں گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے مابین علمی مباحثے کا یہ انداز مجھے پسند نہ آیا۔ (اکبر الہ آبادی بھی کیا سوچتے ہوں گے؟)

کہنے کی باتیں تو اور بھی بہت سی ہیں، مگر آخر میں صرف یہ کہوں گا کہ ہم برِصغیر کے مسلمان بڑے جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ اسلام سے وابستہ ہر چیز سے ہمیں عشق ہے اور یہ عشق بسا اوقات ہمیں کنفیوز بھی کر دیتا ہے؛ چنانچہ عبدالعزیز خالد کے کلام میں عربی الفاظ اور عربی مقولوں کی بہتات دیکھ کر ہم نے انہیں جُبّہ و دستار پہنا کر اونٹ پر سوار کر دیا ہے۔ بالکل اس سادہ لوح مسلمان کی طرح جو دو عربوں کو آپس میں گفتگو کرتے دیکھ کر ہاتھ باندھ کر مؤدب کھڑا ہو گیا تھا کہ شاید تلاوت ہو رہی ہے۔ ہمارے بعض نقاد بھی عبدالعزیز خالد کے کلام میں عربیت دیکھ کر کچھ اس طرح مؤدّب کھڑے ہو گئے ہیں کہ ان کے کلام کی بے شمار خوبیوں کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ خدارا اب سلام پھیر دیں کہ عبدالعزیز خالد آپ کی توجّہ کا منتظر کھڑا ہے۔

محمدؐ طفیل اور محمدؐ نقوش

ایک وقت میں ایک ہی آدمی سے نپٹا جا سکتا ہے، چنانچہ بیک وقت دو آدمیوں کے بارے میں لکھنا خاصا مشکل کام ہے اور اس وقت میں اسی قسم کی مشکل سے دوچار ہوں، یعنی محمد طفیل پر لکھنے بیٹھا ہوں اور محمد نقوش میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ محمدؐ نقوش پر لکھنے بیٹھا ہوں اور محمد طفیل میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ یہ مشکل دراصل یوں پیش آئی ہے کہ محمدؐ طفیل اور محمدؐ نقوش "من تو شدم تو من شدی" کی عملی تفسیر بن چکے ہیں اور ان دونوں کو کسی بڑے آپریشن کے ذریعے بھی ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا اب ممکن نہیں رہا۔ اور لعنت ہے اس انگریزی محاورے پر جو اس وقت مجھے یاد آ رہا ہے کہ LESSER EVIL کا انتخاب تو کرنا ہی پڑتا ہے، کیونکہ یہ محاورہ میرے کام کا نہیں ہے۔ میرے لیے تو محمد طفیل اور محمد نقوش دونوں ایک سے ہیں۔ بس اتنا ہے کہ محمدؐ طفیل سے ملاقات بلکہ ملاقاتیں اکثر ہوتی ہیں اور محمد نقوش سے ملاقات کے لیے ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی رہتی ہے۔

اور جہاں تک جناب محمدؐ طفیل سے ملاقاتوں کا تعلق ہے تو اس کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ یعنی میں جب بھی آنکھیں بند کر کے ان ملاقاتوں کا تصور کرتا ہوں تو طفیل صاحب مجھے صرف تین کیفیتوں میں نظر آتے ہیں۔ ایک تو انہیں دفتر

نقوش میں کتابوں سے بھری ہوئی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھتا ہوں۔ دوسرے پریذیڈنٹ ہاؤس میں صدر سے محوِ گفتگو پاتا ہوں اور تیسرے تھانہ قلعہ گوجر سنگھ میں انہیں ایس ایچ او صاحب کے روبرو دیکھتا ہوں۔ یہ پریذیڈنٹ ہاؤس اور تھانے والا قصہ تو بعد میں بیان کروں گا پہلے ان سے دفترِ نقوش میں ہونے والی ملاقاتوں کا احوال سن لیں۔ میں جب بھی ان کے دفتر میں داخل ہوتا ہوں تو طفیل صاحب سے پہلے کسریٰ منہاس صاحب پر نظر پڑتی ہے اور یہ دونوں عموماً چُپ بیٹھے ہوتے ہیں۔ اتنے میں ایک دو اور لوگ بھی آجاتے ہیں جس پر گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ طفیل صاحب گھنٹی بجا کر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں چائے کا آرڈر دیتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ کیک کا بھی اور پھر چائے اپنے ہاتھوں سے بنا کر مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ کیک کے سلسلے میں عموماً انہیں کوئی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی، کیونکہ جتنی دیر میں چائے بنتی ہے اتنی دیر میں کیک کا "احتساب" ہو چکا ہوتا ہے۔ چائے کے دوران ہلکی پھلکی گپ شپ کا سلسلہ جاری رہتا ہے طفیل صاحب کے ساتھ قربت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے یہاں ثقیل گفتگو کبھی نہیں سنی۔ بس لطیفے ہوتے ہیں، فقرے بازی ہوتی ہے۔ لطیفہ طفیل صاحب کا میدان نہیں؛ چنانچہ وہ لطیفہ صرف سنتے ہیں، سناتے کم کم ہی ہیں۔ فقرے بازی ان کا میدان ہے۔ چنانچہ یہ حرکت کرتے ہیں اور کھل کر کرتے ہیں۔ اسی دوران میں وہ دھیمے دھیمے انداز میں ہنستے بھی رہتے ہیں اور محمد طفیل کا یہ روپ مجھے بہت پسند ہے، کیونکہ جب وہ ہنستے ہیں تو ان کے چہرے پر کچھ اور روپ آجاتا ہے بس میری اور طفیل صاحب کی زیادہ تر ملاقاتیں اس دفتر میں ہوئی ہیں اور وہ بھی یوں کہ ایک طرف میں ہوں، دوسری طرف طفیل صاحب ہیں اور درمیان میں میز اسی

طرح حائل ہے جس طرح پرانے شاعروں کے ہاں درمیان میں تکیہ حائل رہتا تھا!
طفیل صاحب سے ایک اور ملاقات کا منظر جو مجھے یاد ہے وہ پریذیڈنٹ ہاؤس کا ہے، جب لاہور سے احسان دانش، محمد طفیل اور ارشد میر کے ساتھ میں بھی ادیبوں کے مسائل بلکہ "مصائب" بیان کرنے کے لیے صدر صاحب سے ملا تھا۔ یہاں صدر صاحب اور طفیل صاحب کے مابین کچھ مکالمات ہوئے۔ طفیل صاحب کی گفتگو کے جواب میں صدر صاحب نے کہا کہ آپ ضرورت مند ادیبوں کے لیے ایک فنڈ قائم کیجیے، اس کے لیے ایک کمیٹی بنائیے جس میں احسان دانش اور عطاء الحق قاسمی ہوں اور پھر آپ اپنے طور پر کچھ چندہ کر کے مجھے اطلاع کر دیں۔ جتنی رقم آپ نے جمع کی ہو گی میں اس سے چار گنا رقم بطور عطیے کے دوں گا۔ طفیل صاحب دوڑے دوڑے لاہور آئے اور کچھ ہی عرصے میں قریباً ایک لاکھ روپے کی رقم جمع کر لی۔ اس کے آگے میں نہیں جانتا کیا ہوا، البتہ بطور مسلمان مجھے اتنا یقین ہے کہ اگر نیکیوں کی "شرح معاوضہ" ایک کے بدلے میں ستر ہے تو روزِ محشر اس فنڈ میں ستر لاکھ روپے طفیل صاحب کو جمع ملیں گے۔

اور وہ جو تھانہ قلعہ گوجر سنگھ والا قصہ ہے تو وہ بھی مختصر ہی سا ہے۔ دراصل پرنس ہوٹل کے ساتھ جو بے شمار جگہ رائٹرز گلڈ کو الاٹ ہوئی تھی اس کا جھگڑا ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا اس کے لیے طفیل صاحب اور رائٹرز گلڈ میں ان کے معاون ظہور الحق فاروقی صاحب عدالتوں کے پھیرے لگا لگا کر قریباً بھائی پھیرو بن چکے تھے، اوپر سے انہیں اس دوران کچھ دھمکیاں وغیرہ بھی ملیں اور تھانہ قلعہ گوجر سنگھ میں ایس ایچ او صاحب کے حضور میں طفیل صاحب کی پیشی بھی ہوئی۔ بس میں ان کی "حوصلہ افزائی" یعنی ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان کے ساتھ چلا گیا۔ ایس ایچ او

صاحب غالباً خاصے شریف النفس انسان تھے، کیونکہ انہوں نے ہماری کرسی پر بیٹھنے کی جسارت کو نظر انداز کیا اور بس معاملہ طے کرنے پر ہی زور دیتے رہے۔ مَیں نے ان دنوں طفیل صاحب کو بہت پریشان دیکھا، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ خوفزدہ بھی تھے۔ کیونکہ دوسری پارٹی کے کچھ مسلح آدمی انہیں چیرہ کراتے رہتے تھے۔ مَیں نے طفیل صاحب سے کہا کہ انہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ان کے پاس لاٹھیاں اور پستول ہیں تو آپ بھی اپنے کچھ آدمیوں کو ان کے مقابلے کے لیے تیار کریں۔ یعنی "نقوش" کے کسی بھی خاص نمبر کی ایک ایک کاپی انہیں تھما دیں تاکہ کسی اچانک حملہ کا منہ توڑ جواب دیا جاسکے اور مجھے لگتا ہے کہ میرا یہ مشورہ قبول کیا گیا، کیونکہ اس کے بعد طفیل صاحب مجھے پریشان نہیں ہشاش بشاش ہی نظر آئے۔

اب اگر "نقوش" کا ذکر درمیان میں آیا ہے اور یہ آنا ہی تھا کیونکہ میں نے شروع ہی میں ذکر عرض تھا کہ محمد طفیل اور محمد نقوش کسی بڑے آپریشن سے بھی علحدہ نہیں کیے جاسکتے تو اس اعتراف میں آخر کیا ہرج ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں جو مقام "نقوش" کے خاص نمبروں کو حاصل ہے وہ انمٹ ہے "نقوش" کے بارے میں میرے جذبات کا یہ عالم ہے کہ جب اس کے بعض خاص نمبروں کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھ پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ اللہ۔ اللہ۔ یقین نہیں آتا کہ یہ کام کسی فردِ واحد کا ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ کسی بڑے سرکاری ادارے نے ایک وسیع و عریض سٹاف کے ساتھ یہ کارنامے انجام دیے ہوں۔ اپنی بات آگے بڑھانے سے پہلے یہ وضاحت کر لوں کہ یہ کام واقعی فردِ واحد یعنی محمد طفیل کا نہیں بلکہ وہ مختلف نمبروں کے لیے ایسے موزوں افراد کا انتخاب کرتے رہے جو اس کے لیے مطلوبہ

مواد کی تلاش میں انہیں مدد دیں۔ ان سکالرز کی خدمات یقیناً ناقابلِ فراموش ہیں اور اس سے طفیل صاحب کا کریڈٹ بھی کم نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود کو اس پرچے کے ایڈیٹر کہلاتے ہیں مصنف نہیں۔ بہر حال نقوش کے بارے میں مَیں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس عظیم کارنامے کو خراجِ تحسین ادا کرنے کے ضمن میں بظاہر کوئی انتہائی مبالغہ آمیز بیان بھی مجھ سے منسوب کیا جائے تو میں اسے "اون" کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوں کہ نقوش محمد طفیل ہی کی نہیں، پاکستان کی بھی پہچان ہے۔ طفیل صاحب بہت اچھے خاکہ نگار ہیں، لیکن اگر وہ اتنے اچھے خاکہ نگار نہ ہوتے تو بھی ان کے بلند مرتبہ ہونے کے لیے "نقوش" کافی تھا۔ طفیل صاحب رائٹرز گلڈ کے جنرل سیکرٹری ہیں اور اس کام کے تمام تر مثبت پہلوؤں کے باوجود اس سے ان کی عزت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ اس طائرِ لاہوتی کی پرواز میں کوتاہی آئی ہے تاہم نقوش کے صدقے میں طفیل صاحب کے جو سات خون معاف ہیں ان میں سے ایک خون یہ بھی ہے۔

جیمز بانڈ سے اختر امان تک

میں نے چند روز قبل اخبار میں بچوں کے صفحے پر "پانی پینے کے آداب" کی سرخی کے تحت چند ہدایات پڑھی ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں۔ کوزہ پیالہ کو دائیں ہاتھ میں پکڑیں۔ آہستہ آہستہ اور تھوڑا تھوڑا پئیں۔ کھڑے ہو کر یا لیٹ کر نہ پئیں۔ پینے سے پہلے دیکھ لیں کہ پانی صاف ہے یا نہیں ؟ اگر پیتے وقت ڈکار آجائے تو منہ دوسری طرف کر لیں۔ اگر ایک بار سے زیادہ پینا چاہیں تو پھر تین بار کرکے پئیں۔ یہ دیکھ لیں کہ پانی کا برتن ٹپکتا تو نہیں۔ یہ ہدایات پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں فوری طور پر دو افراد ابھرے۔ ایک اپنے صلاح الدین محمود اور دوسرے اختر امان۔ ایک دوسرے سے قطعی طور پر متضاد یہ دو شخصیتیں دو مختلف وجوہ کی بنا پر میرے سامنے آن کھڑی ہوئیں، تاہم یہ میری سوچی سمجھی رائے تھی کہ پانی پینے کے ان آداب کو ملحوظ تو سبھی کو رکھنا چاہیے کہ ان میں خیر و برکت ہے، مگر یہ دونوں ادیب دوست ایسے ہیں جو ان ہدایات کو محض مشورے کے طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ یقینی طور پر عملی زندگی میں ان ہدایات پر عمل بھی کرتے ہوں گے یا ان پر گہرا غور و فکر ضرور کرتے ہوں گے۔ صلاح الدین محمود تو اس لیے کہ اس سطحِ ارضی پر جو نستعلیق وضعدار اور کلچرڈ لوگ موجود ہیں، اگر ان کا صدر منتخب کرنے کے لیے الیکشن کرایا جائے تو صلاح الدین محمود کے

ڈبے میں سے ڈھیر ساری پرچیاں برآمد ہوں گی، چنانچہ میں نے انہیں جب کبھی پانی پیتے دیکھا ہے ان ہدایات پر پوری طرح عمل کرتے دیکھا ہے، بلکہ ان کی نفاست طبع کا تو یہ عالم ہے کہ ایک بار اپنی ایک طویل نظم سناتے ہوئے جب آخری بند پر پہنچے تو انہیں ہلکی سی کھانسی آ گئی۔ اس پر انہوں نے نظم وہیں روک دی اور کہا "صاحب! معذرت چاہتا ہوں، لحن خراب ہو گیا ہے۔ یہ نظم دوبارہ عرض کرتا ہوں"۔ اور جہاں تک اختر امان کا تعلق ہے تو یہ شخص ایسا نہیں ہے، اگر پانی پینے کے مذکرہ آداب سے بہر حال آگاہ ضرور ہے تو اس کی وجوہ قدرے مختلف ہیں۔ مثلاً یہ کوزے اور پیالے کو ہاتھ میں پکڑنے سے پہلے خاصی دیر تک سوچ بچار کرے گا کہ اسے دائیں ہاتھ سے پکڑنا چاہیے یا بائیں ہاتھ سے، کیونکہ ہمارے ہاں کسی شخص کے رائٹسٹ یا لیفٹسٹ ہونے کا "تخمینہ" اسی قسم کی باتوں سے لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر اسے پانی پیتے ہوئے ڈکار آ جائے یا اسے شبہ ہو جائے کہ یہ کوزہ ٹپکتا ہے تو وہ یہ کوزہ ایک طرف رکھ دے گا اور اس کے اسباب و عوامل پر غور و فکر کرتے ہوئے اس کے ڈانڈے ملکی حالات اور بین الاقوامی تغیرات سے ملانے کی کوشش کرے گا اور بالآخر کسی ٹھوس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ایک لائحہ عمل تیار کرے گا تاہم وہ اس ٹھوس نتیجے اور لائحہ عمل دونوں کو صیغۂ راز میں رکھے گا۔ مجال ہے اس ضمن میں کسی کو کانوں کان خبر ہو جائے!

ممکن ہے دوستوں کو یہ ساری داستان مبالغہ آمیز لگے، مگر میرا کعبے کی طرف منہ ہے، میں سچ کہتا ہوں کہ اس قسم کی عادتوں کی وجہ سے اختر امان، اختر امان کم ہے جیمز بانڈ زیادہ ہے۔ میری اس کی دوستی کو دس سال ہو گئے ہیں مگر مجھے کبھی اس کے خیالات و نظریات کی ہوا تک نہیں لگی، حالانکہ بے شمار مواقع پر

اس سے لمبی لمبی بحثیں بھی ہوئی ہیں۔ مَیں نے اس کی دو کتابیں بھی پڑھی ہیں جس میں اس نے اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظریات بیان کیے ہیں، مگر اس کے باوجود میں اپنی اس بات پر قائم ہوں کہ وہ بند کتاب کی طرح ہے، کیونکہ میری اس سے گفتگو ہمیشہ اختلافی نوعیت کی ہوئی ہے۔ یعنی مَیں نے اگر کسی رہنما کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کیا ہے تو وہ میرے نکتہ نظر کو اپنے دلائل کی تلوار سے تہ تیغ کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور جب میں اس کے دلائل سے CONVINCE ہو کر اس کا ہمنوا ہو جاتا ہوں تو وہ نئے دلائل سے اپنے پرانے دلائل کو دھوبی پٹڑا مار کر نیچے گرا لیتا ہے اور ان کا گلا دبانے لگتا ہے۔ وہ کبھی اپنے ہیرو کی پرستش کرتا ہے اور کبھی اسے RIDICULE کرنے لگتا ہے۔ اس کا یہی رویّہ دوسروں کے عزیز دوستوں اور ان کے محترم بزرگوں کے ضمن میں بھی ہے۔ اس کے دوستوں کا پتہ نہیں چلتا، اس کے دشمنوں کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ ہمیشہ "سیلی بوجھ پہیلی" کے چکر میں رہتا ہے۔!

سو آپ یقین جانیں کہ گزشتہ دس سالوں میں اختر امان میرے لیے ہمیشہ جیمز بانڈ رہا ہے بس صرف دو گھنٹے قبل وہ مجھے اختر امان کی طرح ملا ہے جب میں نے اس کا پہلا شعری مجموعہ "خوابوں کے بے نام جزیرے" پڑھنا شروع کیا۔ اس دوران مجھے یہ شخص اس قدر عجیب و غریب لگا کہ اپنی حیرت کے اظہار کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں یعنی جو شخص اپنی نثر اور اپنی طویل گفتگوؤں میں بھی مجھ پر کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا، وہ اس شعری مجموعے میں کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ "خوابوں کے بے نام جزیرے" میں میری ملاقات جس اختر امان سے ہوئی وہ اتنا دردمند اور اس قدر حساس ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے جسم میں برقی

لہریں سی دوڑنے لگتی ہیں۔ اپنی ان نظموں اور غزلوں میں نہ تو وہ کہیں کنفیوز نظر آتا ہے اور نہ کہیں اپنے نظریات چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ نہ وہ کچھ بجث دکھائی دیتا ہے اور نہ اس کی دوستیاں اور دشمنیاں غیر واضح رہتی ہیں بلکہ یہاں وہ اتنا CLEAR ہے جتنا اسے میں گزشتہ دس سالوں کے دوران دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے پاکستان سے محبت ہے اور اس محبت میں کسی حادثے یا سانحے کی وجہ سے بھی کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی۔ اسے اس دھرتی کے علاوہ دنیا کے مختلف خطوں میں بکھرے ہوئے انسانوں سے بھی لازوال انس ہے، وہ سب کے لیے عدل چاہتا ہے اور عدل کا مطلع دھندلا دیکھنے کے باوجود اسے یقین ہے کہ یہ صورتِ حال تبدیل ہو گی، چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

بادلوں کے پیچھے بھی آفتاب زندہ ہے

جس طرح بھی موسم ہوں میرا خواب زندہ ہے

لہٰذا اگر ترقی پسندی کی اصطلاح کا پس منظر سیاسی نہ لیا جائے تو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اپنی شاعری کے حوالے سے وہ اس عہد کا نمائندہ ترقی پسند شاعر ہے اور بے حد خوبصورت شاعر ہے!

اختر امان یقیناً بے حد خوبصورت شاعر ہے کہ اس کی غزلیں اور نظمیں بس دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا سارا CONTENT مقصدی ہونے کے علاوہ مکمل طور پر شاعرانہ ہے، مگر اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا پرابلم ہے اور وہ پرابلم یہ ہے کہ ہر شاعر کے اندر ایک شاعر کے علاوہ ایک مستری بھی ہوتا ہے، شاعر اپنی ساری متاع اس کے حوالے کر دیتا ہے اور پھر میخیں پیڑھی ٹھونکنے کا کام وہ مستری کرتا ہے۔

پرابلم یہ ہے کہ شاعر اختر امان کے پاس جو مستری ہے، وہ قدرے ہڈحرام واقع ہوا

ہے، چنانچہ اس مجموعے کے مطالعے کے دوران یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ چند ایک مقامات پر سہل انگاری سے کام لے گیا ہے تاہم میرے نزدیک یہ چیز قابل معافی ہے، کیونکہ ایک تو اس مستری کی کاریگری اور ہڈ حرامی میں سے کاریگری والا پلہ زیادہ بھاری ہے۔ دوسرے شاعر کے اندر موجود سہل انگاری کرنے والا "مستری" تو برداشت ہو سکتا ہے، مگر وہ مستری برداشت نہیں کیا جا سکتا جو شاعری کے خام مال کے بغیر اپنا ہنر دکھانے کی کوششوں میں مصروف نظر آئے۔ اور تیسرے اختر امان کی شاعری کا مواد اور اظہار بہر حال اس کا اپنا ہے جبکہ ہمارے ہاں ایسے شاعر بھی موجود ہیں جن کے امپورٹیڈ خیال اور اظہار کو دیکھتے ہوئے یہ مطالبہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ان پر کم از کم دو سو فیصد کسٹم ڈیوٹی عائد کی جائے۔ اور انہیں "گفٹ سکیم" سے خارج کر دیا جائے: تاہم ان تمام وجوہ کے علاوہ میرے لیے اس ساری صورت میں سب سے زیادہ مسرت کا مقام یہ ہے کہ طویل بحثوں کے دوران بھی اپنے آپ کو چھپا جانے والا شخص اپنے اس شعری مجموعے میں کھل کر سامنے آگیا ہے اور یوں میرا بچھڑا ہوا اختر امان دس سال بعد مجھے واپس مل گیا ہے اب میں صرف اختر امان کو جانتا ہوں، کسی جیمز بانڈ کو نہیں جانتا۔

شریف بنجارا

شریف بنجارہ شاعر ہے اور لاہور کے اس قہوہ خانے کا باورچی اور بیرا ہے جہاں روزانہ شام کو ادیبوں کی بیٹھک ہوتی ہے، شریف بنجارا کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو تو مَیں بعد میں کروں گا، پہلے مَیں "سانجھاں" کے تنویر ظہور کو اس امر پر مبارک باد دے لوں کہ اس نے اسی شریف بنجارے کے اعزاز میں گزشتہ ہفتے ایک خصوصی محفل منعقد کی کارڈ پر بہت سے دانشوروں کے نام درج تھے، جنہوں نے شریف بنجارے کے حوالے سے گفتگو کرنا تھی۔ مَیں چونکہ بدقسمتی سے اس محفل میں شریک نہیں ہو سکا اس لیے مَیں نہیں جانتا کہ انہوں نے کیا کہا۔ ظاہر ہے انہوں نے بہت اچھی باتیں کہی ہوں گی۔

جیسا کہ مَیں نے ابھی عرض کیا مَیں اس محفل میں موجود نہ تھا، مگر مجھے اتنا علم ضرور ہے کہ اس محفل میں شریف بنجارے کی شاعری کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ گفتگو کی تفصیلات تو مجھے معلوم نہیں، مگر مجھے اندازہ ہے کہ دانشوروں نے اس کی شاعری کو لوک شاعری قرار دیا ہو گا اور اس ضمن میں خاصی حوصلہ افزا باتیں کہی گئی ہونگی۔ انہوں نے شریف بنجارے کو تھپکی دی ہو گی اور لوک دانائی کی باتیں اس کی شاعری میں تلاش کی ہوں گی۔ اگر

ایسا ہوا ہے تو کچھ غلط نہیں ہُوا، لیکن میرے نزدیک شریف کنجاہی کے لیے شاعری ذریعۂ عزت نہیں، کیونکہ شاعر تو اس قہوہ خانے میں تھوک کے حساب سے آتے ہیں اور ان میں ایسے ایسے عظیم شاعر بھی ہیں جو صبح گھر سے بیوی کی گالیاں اور بچوں کی بددعائیں لے کر نکلتے ہیں، قرض خواہوں سے منہ چھپاتے اور رستے بدل بدل کر محلّے سے بخیر و عافیت نکلنے میں کامیاب ہوتے ہیں، سارا دن منہ سے بھُوا اگلتے ہیں اور شام کو قہوہ خانے کی فضا متعفن کر کے واپس اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں جہاں ان کی بیوی ہاتھ میں بیلنا پکڑے ان کی منتظر ہوتی ہے، لہٰذا شریف کنجاہی اگر شاعر ہے تو ایک امریکی "روزمرہ" کے مطابق اس پر "BIG DEAL" ہی کہا جا سکتا ہے۔

سو میری اس گفتگو سے ثابت ہُوا کہ اگر مَیں نے آغاز میں شریف کنجاہی کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریب کے منتظمین کو اس کام پر مبارک باد دی تھی، تو اس لیے نہیں کہ انہوں نے ایک شاعر کے اعزاز میں تقریب کا انعقاد کیا، بلکہ اس لیے کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کو عزت اور احترام کی مسند پر بٹھایا جو دن کا بیشتر وقت عظیم شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی قربت میں گزارنے کے باوجود ابھی تک اپنا "ایمان" سلامت رکھے ہوئے ہے اور شریف کنجاہی کے لیے ذریعۂ عزت یہی چیز ہے۔ مَیں اسے گزشتہ پانچ برس سے دیکھ رہا ہوں اور مَیں نے اس تمام عرصے میں لالچ اور تحریص نام کی کوئی چیز اس کی شخصیت میں نہیں دیکھی، وہ نہ کسی سے کچھ مانگتا ہے اور نہ دل میں اس کی تمنا رکھتا ہے۔ اس کے سینے میں ایمان کی شمع روشن ہے جو اسے ان اندھیروں میں نہیں بھٹکنے دیتی جن میں ٹامک ٹوئیاں مارتے مارتے ہم لوگ

بچھاوے" ہو گئے ہیں۔ مَیں نے اسے ہمیشہ تین کیفیتوں میں دیکھا ہے۔ ایک اس وقت جب قہوہ خانے میں بہت رش ہوتا ہے۔ ان لمحوں میں اس کی ڈیوٹی اگر باورچی خانے میں ہے تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی باورچی خانے سے باہر دکھائی نہیں دے گا یا اگر وہ سروس پر مامور ہے تو تیزی سے ایک میز سے دوسری کی طرف جاتے، برتن سجاتے اور برتن اٹھاتے دکھائی دے گا۔ ان لمحوں میں وہ کبھی "فکرِ سخن" میں مبتلا نہیں ہوتا۔

شریف بنجارے کو ایک دوسری کیفیت میں، مَیں اس وقت دیکھتا ہوں، جب رش کم ہو جاتا ہے اس دوران وہ میز صاف کرنے والا رومال کاندھوں پر ڈالے فرش پر ایڑیوں کے بل بیٹھ جاتا ہے اور شاعروں اور ادیبوں کے چہروں کو بڑی عقیدت اور محبت سے دیکھتا ہے اور ان کی باتیں سنتا ہے، ان لمحوں میں مَیں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ جیسے وہ علم و دانش کے موتی سمیٹنے کے لیے اپنی جھولی پھیلائے بیٹھا ہے اور یہ جھولی وہ گزشتہ برسہا برس سے اسی طرح پھیلائے ہوئے ہے۔ یہ عجیب شخص ہے ہیجڑوں سے اولاد کی تمنا رکھتا ہے!

بنجارے کا تیسرا روپ شاعر کا روپ ہے جب رات کو قہوہ خانے کی میزیں خالی ہونے لگتی ہیں تو شریف بنجارہ قہوہ خانے میں موجود کسی مدیر جریدہ کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا اتھما دیتا ہے جس پر اس کی نظم درج ہوتی ہے جو کسی دوسرے کی ہینڈ رائٹنگ میں ہوتی ہے کیونکہ بنجارہ چٹّا اَن پڑھ ہے، اپنی نظم لکھوانے کے لیے اسے کسی "پڑھے لکھے" کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں۔ یہ نظم اس نے مدیر کو اشاعت کی غرض ہی سے دی ہوتی ہے، لیکن وہ اسے چھپوانے کے لیے سر دھڑ کی بازی نہیں لگا دیتا، بلکہ مدیر کو یہ نظم دے کر وہ اس طرح بھول

جاتا ہے جس طرح بھلے لوگ نیکی کر کے بھول جاتے ہیں جبکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہمارے ہاں دس فیصد شاعر اپنے معاشی مسائل اور اسّی فیصد اپنی غزلیں چھپوانے کے لیے ذلیل ہوتے ہیں جبکہ شریف بنجارہ کے لیے یہ حوالہ بے معنی ہے۔ چنانچہ اس کی بیسیوں نظمیں مدیرانِ جرائد کی جیبوں ہی میں دھری رہ جاتی ہیں، لیکن بنجارے کے دل میں ان کے لیے موجود محبت اور احترام کے جذبے میں رتی بھر فرق نہیں آتا۔ یہ لوگ اور لکھنے پڑھنے والے تمام لوگ اس کا آئیڈیل ہیں۔ خدا اس کی حالت پر رحم کرے۔

مگر اس کے علاوہ شریف بنجارہ کا ایک چوتھا روپ بھی تو ہو گا جس کے بارے میں، مَیں بے خبر ہوں یعنی مَیں نہیں جانتا جب حرص و ہوا سے مبّرا اپنے خیالوں میں گم، محبّت کے خواب دیکھنے والا یہ شخص رات کو اپنے گھر میں داخل ہوتا ہو گا، تو اس کی بیوی اور بچّے اس کا استقبال کس طرح کرتے ہونگے؟ وہ اس کی جیبیں ٹٹولتے ہوں گے یا اس کے دل کی دھڑکن سنتے ہوں گے؟ ظاہر ہے مَیں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، مگر مَیں اتنا جانتا ہوں کہ شریف بنجارہ تو اپنے ایمان کی روشنی سے قہوہ خانے کی میلی میلی فضا کو اجلا اجلا کر دیتا ہے۔ سو مجھے یقین ہے کہ جب وہ اپنے بجھے بجھے گھر میں داخل ہوتا ہو گا تو اس کے در و دیوار بھی روشن روشن لگتے ہوں گے!